سودیشی ریل
اور دوسرے افسانے

شوکت تھانوی



ادارۂ فروغ اردو لاہور

سودیشی ریل اور دوسرے افسانے

(بُرے بھلے)

شوکت تھانوی

ادارہ فروغِ اردو لاہور

بار دوئم

قیمت ۶ روپے ۵۰ پیسے

محمد طفیل مالک ادارہ فروغِ اردو نے اپنے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی

ترتیب

حکیم محمد امین کے نام

جو ڈاکٹر بھی ہیں

میں اُن کا دوست بھی ہوں اور مریض بھی

عرضِ ناشر

یہ کام تو نقادوں کا ہے کہ وہ کسی مصنف کی فنی خوبیاں اور نقائص قارئین کے سامنے پیش کریں۔ میں تو صرف اتنا مجرم ہوں کہ شوکت صاحب کی اس کتاب کا ناشر ہوں چونکہ ہمیشہ سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ ہندوستان کے بلند پایہ مصنفین کی اچھی کتابیں ادب نواز حلقے کے سامنے پیش کرنے کی سعی کروں۔ لہٰذا آج میں اپنے نزدیک اس کتاب کو بھی اپنی ہی خواہش کی تکمیل کا ایک حصہ سمجھتا ہوں اس کے ساتھ ہی یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ شوکت صاحب کی تمام تصنیفات میں جو اہمیت اس کتاب کو حاصل ہے۔ وہ ان کی کسی اور کتاب کو میسر نہیں۔

اس مجموعے میں شوکت صاحب نے اپنے اُن تمام مضامین کو یکجا پیش کیا ہے جو نقادانِ فن کے نزدیک فنی اعتبار سے شوکت صاحب کے چوٹی کے مضامین میں شمار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ نئے مضامین بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے

کہ سارے نئے مضامین اس معیار کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے تو شوکت صاحب کو "وجہ تسمیہ" میں لکھنا پڑا کہ اس انتخاب میں میرا بھی حصہ ہے پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ نئے مضامین شوکت صاحب کی نظر میں لاکھ برے سہی۔ لیکن ادبی حیثیت میں ان مضامین کو بھی اُردو ادب میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہو گا۔ انشاء اللہ۔

مَیں آخر میں شوکت صاحب کے علاوہ خود بھی محترم مولانا محمد صدیق صاحب مالک صدیق بک ڈپو لکھنؤ اور برادرم ظہیر صاحب کا خاص طور پہ ممنونِ کرم ہوں۔ کیونکہ ان ادب نواز دوستوں کا اس مجموعہ کی ترتیب و تکمیل میں بہت بڑا حصہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان حضرات کی کرم فرمائی شاملِ حال نہ ہوتی۔ تو شوکت صاحب نہ اس مجموعہ کو مرتب کر سکتے اور نہ ہی میں شائع کر سکتا۔

۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء

محمد طفیل

وجہ تسمیہ

آج کل کتابوں کے نام رکھنے کا طریقہ یا تو سائن بورڈوں سے اخذ کیا گیا ہے یا مشہور اشتہاری کارخانوں سے ۔ سنگ و خشت ، شعلہ و شبنم ، عرش و فرش ، آیات و نغمات ، وغیرہ کا تخیل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصغر علی محمد علی ، بینو ڈلنشا ، ہلیبی مادھو ، شمبھو ناتھ ، لارنس میو سے متاثر ہے ۔ اب سے کچھ پہلے بھی ناولوں اور ڈراموں کے نام اسی قسم کے ہوا کرتے تھے ۔ لیلیٰ مجنوں ، شیریں فرہاد ، گلرو زرینہ ، منصور موہنا وغیرہ گویا کتابوں کے نام رکھنے کا یہ طریقہ نیا بھی ہے اور پرانا بھی ۔ اس میں صنعتِ تضاد بھی ہے اور صنعتِ تداخلِ فصلین بھی بلکہ زیرِ نظر کتاب کا نام "بُرے بھلے"[1] ایک اور خاص رعایت سے رکھا گیا ہے ۔ دراصل ادارۂ "فروغ اردو" کے مالک عزیزی محمد طفیل کا ارادہ یہ تھا کہ وہ میرے تمام مزاحیہ مضامین کے مجموعوں کا ایک "عطرِ مجموعہ" شائع کریں اور اپنے مضامین میں سے انتخاب میں خود کروں ۔ مگر میں نے اُن کی رائے سے کچھ اختلاف کیا اور انہوں نے میری رائے سے کچھ اتفاق ، ارادہ ہوا کہ کتاب کا نام رکھ دیا جائے "اختلاف و اتفاق"

---

[1] اس کتاب کا پہلا ایڈیشن "بُرے بھلے" کے نام سے شائع ہوا تھا ۔

کہ سارے نئے مضامین اس معیار کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے تو شوکت صاحب کو "وجہ تسمیہ" میں لکھنا پڑا کہ اس انتخاب میں میرا بھی حصّہ ہے پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ نئے مضامین شوکت صاحب کی نظر میں لاکھ بُرے سہی۔ لیکن ادبی حیثیت میں ان مضامین کو بھی اُردو ادب میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہو گا۔ انشاء اللہ۔

مَیں آخر میں شوکت صاحب کے علاوہ خود بھی مخترم مولانا محمد صدیق صاحب مالک صدیق بک ڈپو لکھنؤ اور برادرم ظہیر صاحب کا خاص طور پہ ممنونِ کرم ہوں۔ کیونکہ ان ادب نواز دوستوں کا اس مجموعہ کی ترتیب و تکمیل میں بہت بڑا حصّہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان حضرات کی کرمفرمائی شاملِ حال نہ ہوتی۔ تو شوکت صاحب نہ اس مجموعہ کو مرتب کر سکتے اور نہ ہی میں شائع کر سکتا۔

محمد طفیل

۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء

وجہ تسمیہ

آج کل کتابوں کے نام رکھنے کا طریقہ یا تو سائن بورڈوں سے اخذ کیا گیا ہے یا مشہور اشتہاری کارخانوں سے، سنگ و خشت، شعلہ و شبنم، عرش و فرش، آیات و نغمات وغیرہ کا تخیل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصغر علی محمد علی، ہینوڈ لنشا، ہیلی ماد ھو، شمبھو ناتھ، لارنس میو سے متاثر ہے۔ اس سے کچھ پہلے بھی ناولوں اور ڈراموں کے نام اسی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل و زرینہ، منصور موہنا وغیرہ گویا کتابوں کے نام رکھنے کا یہ طریقہ نیا بھی ہے اور پرانا بھی۔ اس میں صنعتِ تضاد بھی ہے اور صنعتِ تداخلِ فصلین بھی بلکہ زیرِ نظر کتاب کا نام "بُرے بھلے"[1] ایک اور خاص رعایت سے رکھا گیا ہے۔ دراصل ادارہ "فروغ اردو" کے مالک عزیزی محمد طفیل کا ارادہ یہ تھا کہ وہ میرے تمام مزاحیہ مضامین کے مجموعوں کا ایک "عطر مجموعہ" شائع کریں اور اپنے مضامین میں سے انتخاب میں خود کروں۔ مگر میں نے اُن کی رائے سے کچھ اختلاف کیا اور انہوں نے میری رائے سے کچھ اتفاق، ارادہ ہوا کہ کتاب کا نام رکھ دیا جائے "اختلاف و اتفاق"

---

[1] اس کتاب کا پہلا ایڈیشن "ہمارے بھلے" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

میرا مشورہ یہ تھا کہ نئے مضامین کا مجموعہ شائع ہو اور انتخاب کو مصنف کی موت کے بعد کے لئے اٹھا رکھا جائے۔ آخر سمجھوتہ یہ ہوا کہ کچھ انتخاب اور کچھ نئے مضامین کچھ میرا انتخاب اور کچھ پبلشر صاحب کا انتخاب اس لئے کہ وہ میرے انتخاب سے مطمئن نہ تھے اور میں ان کے انتخاب پر ایمان لانے کو تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تھا چڑا اور ایک تھی چڑیا۔ چڑا لایا دال کا دانا اور چڑیا لائی چاول کا دانا، دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ اب ڈر یہ ہے کہ اس کھچڑی انتخاب کے سلسلے میں پڑھنے والے کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ "دُر موئے میری آنکھیں دُکھتی ہیں"

مشہور مثل ہے کہ دہی والا اپنی دہی کو کبھی کھٹا نہیں کہتا۔ لیکن جب وہ خود دہی کھاتا ہے تو اسی دن کھاتا ہے جب واقعی دہی میٹھا ہو۔ اولاد والدین کے لئے ایک عجیب معمہ ہوتی ہے۔ والدین اپنی بڑی چھوٹی منجھلی سنجھلی اولاد سے یہ کہہ کر یکساں محبت کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہ سہی لیکن ان میں سے جس کسی کو کاٹا جائے درد یکساں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود ہر ماں باپ کا ایک لاڈلا بچہ بھی ہوا کرتا ہے۔ محبت برابر ہی مگر اس بچے کا خیال غیر ارادی طور پر کچھ زیادہ ہی رکھا جاتا ہے اور واقعی والدین کا یہ کہنا کہ اولاد اولاد سب برابر ہے۔ دیانتداری کے بھی خلاف ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک حسین بچہ ایک بدصورت بچے کے برابر نہیں

ہو سکتا۔ اولاد ہونے کی وجہ سے بدصورت بچے سے تنفر پیدا نہ ہونا دوسری بات ہے
لیکن حسین بچے پر پیار آنا بھی ایک قدرتی چیز ہے۔ ایک بچہ ذہین ہے۔ اور دوسرا
گاؤدی دونوں کو ایک لاٹھی کیسے ہانکا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح مصنف کی اولاد
اُس کے مضامین ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہر مضمون کے لئے اپنے دل میں ایک شفقت پاتا
ہے۔ مگر خود اس کی نظر سے اپنے مضامین کی اصل حقیقت پوشیدہ نہیں ہوتی۔ وہ جانتا
ہے کہ اس کا کونسا مضمون ہونہار نکلا اور کونسا نالائق نکل گیا۔ کس نے نام روشن
کیا اور کس نے لٹیا ڈبوئی۔ کونسا باعثِ فخر ہے، اور کونسا باعثِ ننگ۔ قصہ دراصل
یہ ہے کہ ایک اہلِ قلم کا ہر نتیجۂ فکر یکساں حالات اور یکساں ماحول کے ساتھ منظرِ عام
پر نہیں آتا۔ ایک مضمون کے لکھنے کے لئے مصنف کا دل خود چاہتا ہے۔ مضمون
دماغ میں خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ دماغ سے کہا جائے کہ تیرا دل
چاہے یا نہ چاہے مگر ایک مضمون پیدا کر۔ شعر زادن اور شعر گفتن میں جو فرق ہے وہ
مصنف خوب سمجھتا ہے مگر حالات خود اس کو بھی مجبور کر دیا کرتے ہیں کہ وہ شعر گفتن
کے ساتھ ساتھ شعر زادن سے بھی کام لے۔ ایک مشاق شاعر طرحی مشاعروں میں
اپنی کاریگری کے ماتحت ایک کامیاب غزل سامعین کو یقیناً سنا سکتا ہے مگر وہ بات
اس غزل میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو اُس کی طبعزاد غزل میں پیدا ہوتی ہے۔ بالکل

اسی طرح ایک مضمون نگار سے طرحی مضامین لکھوانا اور اُن سے توقع یہ رکھنا کہ وہ اس کے طبعزاد مضامین کی ٹکّر کے ہوں گے یقیناً زیادتی ہے۔ میں دوسرے مضمون نگاروں کے متعلق تو نہیں جانتا البتہ مجھ پر ایسے سخت وقت اکثر گذرے ہیں کہ میں ایک طبعزاد مضمون لکھ کر دس طرحی مضامین لکھنے پر مجبور کیا گیا۔ مثلاً سودیشی ریل ایک طبعزاد مضمون تھا۔ مگر اس مضمون کی کامیابی نے ہر طرف سے فرمائشوں کی بوچھار شروع کر دی۔ اور باوجود انکار کے دو تین سودیشی مضامین لکھنے ہی پڑے۔ مثلاً سودیشی ڈاک خانہ، سودیشی کونسل اور سودیشی سے بدیشی وغیرہ اسی طرح تعزیت نامی ایک مضمون کو لوگوں نے پسند کیا اور تعزیت کے بعد چالیسواں مجھ سے زبردستی لکھوایا گیا۔ ریڈیو کی تقریروں کے متعلق میں ہمیشہ سے بددل ہوں۔ یہ تمام مضامین طرحی ہوتے ہیں۔ اور ان مضامین کے سلسلہ میں مضمون نگار کو ردیف و قافیہ کی پوری پوری پابندی کرنی پڑتی ہے۔ مضمون کا عنوان ریڈیو کی طرف سے آتا ہے۔ مضمون کا دائرہ تحریر ریڈیو کی طرف سے مقرر اور معیّن ہوتا ہے۔ مضمون کی زبان تک کے لئے ریڈیو کی طرف سے خاص ہدایتیں ہوتی ہیں اور مضمون کے لئے وقت بھی ریڈیو کی طرف سے مقرر ہوتا ہے کہ پندرہ منٹ کی حدود سے نہ آگے بڑھو اور نہ پیچھے ہٹو۔ ان پابندیوں کے ساتھ جو مضامین لکھے جائیں گے وہ کیونکہ معیاری ہو سکتے ہیں۔ معیار سے میرا مقصد عام ادبی معیار نہیں ہے بلکہ ہر مصنف

کا ایک ذاتی معیار بھی ہوتا ہے اور مصنف خود اپنے ہر مضمون کو اُس معیار پر جانچ کر بلند یا پست ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں میں نے اپنے اُن مضامین کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو مجھے خود پسند ہیں اور طفیل صاحب وہ مضمون شامل کر رہے ہیں جو اُن کو پسند ہیں۔ اس دوعملی کے باوجود یہ حق مجھ کو دیا گیا ہے کہ کتاب کا نام میں رکھوں۔ لہٰذا میں ایک ایسا نام رکھ رہا ہوں جو بظاہر شاعرانہ کسرِ نفسی معلوم ہوگی مگر در اصل چل رہا ہوں یہ سیاسی چال اگر پڑھنے والوں نے اس کتاب کو پسند کیا تو مضامین میرے ہیں مجھ کو فخر کا حق حاصل ہی ہے۔ اگر ناپسند کئے گئے یہ مضامین تو طفیل صاحب کے انتخاب کا قصور ہے اور میں نے تو گویا کتاب کا نام ہی "برے بھلے" رکھ دیا ہے گویا پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس میں دونوں قسم کے مضامین ہیں۔ بہرحال جہاں تک میرے انتخاب کا تعلق ہے میں نے اچھے اور برے تمام مضامین کے سلسلہ میں صرف ان ہی مضامین کو شامل کیا ہے جن کے لکھنے میں بیرونی محرکات کے علاوہ اندرونی تحریک کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری اور طفیل صاحب کی پسند کو دوسرے بھی پسند کریں گے یا نہیں۔ بہرصورت ہم دونوں اپنے نزدیک اس مجموعے کو ایک بہترین تحفہ بنا کر پیش کر رہے ہیں تحفے کے سلسلہ میں تحفے کی قسم اور قیمت سے زیادہ پیش کرنے والے کے خلوص کو دیکھا جاتا ہے میں اور تو کچھ

نہیں جانتا۔ اپنے خلوص پر اعتماد ضرور کرتا ہوں۔ رہ گئے طفیل صاحب وہ اس مجموعے کی زیب و زینت کے سلسلہ میں بھی اپنی طرف سے خلوص کا پورا ثبوت دیں گے۔ اس مجموعے کے کچھ مضامین میرے لاڈلے بچے ہیں اور کچھ طفیل صاحب کے پسندیدہ بچے۔ بہر صورت ان دونوں قسم کے بچوں کو اچھے لباس میں دیکھ کر جو مسرت مجھے ہو سکتی ہے وہ شاید کسی اور طرح حاصل نہ ہو۔ دراصل طفیل صاحب کے ذوقِ سلیم پر مجھے ایسا ہی اعتماد ہے کہ میں اس مجموعے کی دلآویزی تخیل میں ابھی سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے پسندیدہ مضامین پیش کیے ہیں اور وہ یقیناً طابع اور ناشر کی حیثیت سے اپنی پسند کا ایک معیاری نمونہ اس کتاب کی صورت میں پیش کریں گے۔ انشاء اللہ۔

ممتاز منزل۔ لکھنؤ

۱۰ اگست ۱۹۴۵ء

شوکت تھانوی

سودیشی ریل

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا، مگر "بندے ماترم" کے نعروں پہ کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی یہ ضد ہے کہ ہمارا چاہے جو حال بھی ہو، بیمار ہوں، کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو، مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچکر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقّہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دکان پہ یہ کہہ کر رکھ دیں کہ "بھائی ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے۔ جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پہ

گاڑھے کی گاندھی کیپ ڈاڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا۔ اس لئے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہر حال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے، اس لئے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف۔ کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ تھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اُتر دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لئے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لئے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں کبھی

نثر میں، کبھی نظم میں کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی ادھر مڑ کر کبھی اُدھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لئے تھے:۔

بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں ——— تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ بنیں ——— سرگرمیاں ——— اب تیار ہو جاؤ ——— ہوشیار رہو ——— کہ تم کو ——— ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے ——— اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے ——— دوسری طرف گھوم گئے) خواب غفلت سے بیداری کا وقت ——— یہ ہے ——— اور وہاں تم ——— برٹش گورنمنٹ ——— سوراج سودیشی ——— چرخہ ——— کھدر ——— (چیرز کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹہ میں ہم نے صرف یہی سُنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انہوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں ہمارے لئے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے

کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے دکان پر سے حُقّہ کا نیچا لیا صراحیاں ایکے پر لادیں اور گھر پہنچ گئے، اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقّہ بھرا آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے، اس لئے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اُتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائیگا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لکچر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کیلئے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے نہ بدیشی گارڈ ہوتا، نہ فارن ڈرائیور، نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے چاہے تھرڈ میں بیٹھتے، چاہے فرسٹ میں، ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا، ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ——— ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایک دم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایکدم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں جھنڈیوں اور گیسوؤں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا

ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ " بھائی یہ کیا ہے ؟" جواب ملا کہ " کیا سوتے تھے ؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا ؟" ہم نے پھر بڑا سا منہ کھول کر کہا " سوراج ؟" جواب ملا " ہاں سوراج سوراج !" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ " واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑا ہی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے۔ مگر واللہ کمال تھا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا۔ حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج سے ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خود مختارانہ سانس لیکر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیئے یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لئے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت

ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچکر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا :-

" بابو جی ! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجئے "

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے۔

" ایک بات کہہ دیں یا مول تول ؟ "

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں۔ اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا :-

" جناب سنیئے تین روپیہ ہوئے لائیے روپے اور ٹکٹ لیجئے "

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا :-

" جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنہ تو کرایہ ہے آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیئے ہے۔ کانپور کا سیکنڈ کلاس۔

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا :-

جناب والا ! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے اکوڑی کم نہ لونگا۔ جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے "

میں "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا "

بابو "کل کی بات کل کے ساتھ، آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے "

میں " یہ کہیئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی "

بابو " لایئے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات، ڈھائی روپے دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے "

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ بن بغیر ٹکٹ کے سفر کرونگا اور یہ سوچکر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ

کہ بابو صاحب نے پھر آواز دی :-

"سنیئے تو جناب، ٹھہریئے تو جناب، دیکھئے تو جناب، اچھا دو روپے دے دیجیے؛ لائیے وہی ایک روپیہ تیرہ آنہ دیجئے ——— اب وہ بھی نہ دیجئے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے۔ لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا۔ ایک روپیہ دینگے۔ ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو۔"

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے۔ مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے :-

"لائیے صاحب لائیے۔ بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا۔ لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر درجہ دوم کا چوبہ گھڑ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی۔ جو غالباً ان کے

دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو اِدھر سے دیکھا اُدھر سے دیکھا اور وہ تین مرتبہ غور سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے :-

جناب والا رات کو موراجیہ ملی ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب۔ آپ تو سفر کیجئے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیئے"

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی۔ مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ، نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے۔ اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اُس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا اُلٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیال۔ مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔

اسباب کے بغلے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ بمشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اُٹھانے کو کہا اُس نے چیں بہ جبین ہو کر جواب دیا۔

" اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہم " معاف کیجئے گا غلطی ہوئی " کہہ کر پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ " یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے پہلے تو اس صورت کے قلی ہُوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو پھر قلی کس صورت کا ہو گا ؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اُٹھایا اور دو مرتبہ کہہ کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہُوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیئے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور ؟ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے۔ لیکن انھوں نے صرف یہ جواب دیا کہ " بابی بھیا ہمکا نا ہیں مالوم " یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ

کلاس کے معزز پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ "اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہو گی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لئے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف" ہم نے گھبرا کر پوچھا:۔

"لیکن یہ فیصلہ کب ہو گا"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے"

ہم نے پھر پوچھا "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا"

جواب ملا کہ ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟

اب ہم بالکل راضی برضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لئے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی اچھا اس لئے نہیں کہتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا۔ جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر، کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر، کبھی انجن کو منتظر

اور مغرب کی سمت حدِ نظر تک ڈھونڈھ کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے باآوازِ بلند چیخنا شروع کیا۔

بیٹھنے والے مسافرو بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے۔

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے۔ اور ان الفاظ پر شک کرنا، اس لئے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے اُن سے ہم نے لاکھ کہا "ارے سیکنڈ کلاس ہے" "اماں سیکنڈ کلاس ہے بھائی سیکنڈ کلاس ہے" مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور یہی کہتے رہے "ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے۔ ہم ٹکس لیا ہے" خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں مگر

گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انہیں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے عرض کر دیا۔ جس کا جواب اُنہوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا۔ بیٹھئے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں۔ سب بھائی ہیں۔ سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے سب کو برابر کا سمجھئے، جائیے تشریف رکھئے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔ ہم یہ کھرا جواب سُنکر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہو گا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے۔ انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے۔ لیکن ابھی

تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لئے گیا ہوا ہے "

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا۔ اس لئے جانا ضروری تھا۔ گاڑی چھوٹتی نہ تھی۔ اس لئے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا۔ اس لئے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنہوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا۔ اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سن سن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش ذریہ پائندہ گو اور لالی اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لئے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب

نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سُرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں۔ مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔

ڈرائیور نے بھی اُن کے بیجا غصہ کا جواب کڑک کر دیا۔ جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے۔ دو گھنٹہ سے للّو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہدیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتایئے میرا کیا قصور ہے۔" گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چُپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بھدی بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے لئے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح

جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے۔ مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتایئے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا۔ مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد للّو فائرمین کوئلہ کی گٹھڑی لیئے یہ کہتا ہوا آ پہنچا:۔

”آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنہ میں ملا ہے، بھاگتا ہوا آ رہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔“

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا ”روکو۔ روکو۔ گارڈ صاحب رہ گئے“۔ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلّا چلّا کر پوچھنا شروع کیا۔

”ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا ——— لائن کلیر“ ڈرائیور نے بھی

چلا کر جواب دیا "لے لیا تھا ـــــ لے لیا تھا ـــــ گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں"۔ گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لئے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے۔ اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے۔ غصہ ہم پر اتارا، اور جھڑک کر فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر سمجھو کہ یہ گاڑی ہی ہے، تم میل ایکسپریس لئے پھر رہے ہو" ان کا جواب سنکر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سب سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی پھک پھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ :۔

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کونسا تھا؟"

ڈرائیور:۔ جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟"

اسٹیشن ماسٹر:۔ ایک تو گاڑی لے آیا اُوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دونگا دوسرا ڈرائیور رکھ لونگا جو مجھ سے گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمھارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر آتی"

ڈرائیور:۔ دیکھئے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجئے نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے، جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے۔ خوب کیا گاڑی لائے اب اس دفعہ پر تو ہزار مرتبہ لائیں گے۔ دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے"

اسٹیشن ماسٹر:۔ دیکھئے گارڈ صاحب منع کر لیجئے اس کو، کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں، میں چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیتا ہوں"

گارڈ:۔ جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو، ہائیں ہائیں یہ کیا کہتے ہو، اماں تم ہی ہٹ جاؤ، بھائی تم ہی ہٹ جاؤ۔ ارے ارے چھوڑ دو بھی، ہٹو بھی،

سُنو تو سہی، ارے بابا سنو تو۔

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنا شروع کر دیئے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بیچارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"گارڈ صاحب اے گارڈ صاحب، اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پر آ رہی ہے غضب ہو گیا!"

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کر دیا:۔

"مسافرو جلدی اُترو جلدی اُترو گاڑی لڑتی ہے گاڑی لڑتی ہے جلدی اُترو۔"

سب مسافر گھبرا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بُری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پہ آ پڑا۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ حقّہ کی نے میرے مُنہ پر آ کر گری تھی۔ حقّہ جل چکا تھا آرام کرسی

بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے
اُٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس لئے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ
چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

جس کیلئے کیا سفر

خدا نہ کرے کہ کبھی کسی شریف مرد آدمی کو ریل میں یا اسٹیشن پر یا مسافر خانہ میں یا ٹکٹ گھر کے قریب کسی سے عشق پیدا ہو جائے۔ اس قسم کا عشق جس کا تعلق ریلوے سے ہو۔ بیچارے عاشق کو بجائے "صحرا بصحرا" پھرانے کے اسٹیشن بہ اسٹیشن "پھراتا ہے اور وہ تھرڈ کلاس کے زنانہ ڈبے کی کھڑکی سے جھانک کر دل لے جانے والا جلوہ پھر مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ریل ہوتی ہے جس کا کام ہے چلنا، کوئی جلوہ گہِ ناز تو ہے نہیں کہ ایک ہی جگہ پر قائم ہے اور عشاق پسِ دیوار بیٹھے بیٹھے سر پھوڑا کریں اس ریل کے عشق کا تو بس علاج ہی علاج ہے

کہ یا تو اُس رہزن تمکین د ہوش کا ٹکٹ دیکھ کر اسی جگہ کا ٹکٹ خرید لیا جائے اور جو "نیت امام کی وہی ہماری" کہہ کر ساتھ ہو لے، یا پھر اسی ٹرین کے نیچے لیٹ کر جان آفریں کو جان سپرد کر دی جائے۔ لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ عشق کا حملہ ہوتے ہی بیچارے عاشق کے ہوش و حواس ہی کب قائم رہتے ہیں کہ اس پروگرام کو پیشِ نظر رکھ کر اس پر عمل کرے۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ حسن تو بجلی گر کر ریل کے ساتھ چھک چھک کرتا ہوا چل دیتا ہے اور بے چارہ عاشق پلیٹ فارم پر اس طرح تڑپتا ہے گویا ریل سے کچل کر جان دے رہا ہو۔ اگر عشق نے زیادہ ستایا تو اُسی سمت کو جانے والی کسی گاڑی پر خواہ وہ مال گاڑی کیوں نہ ہو بیٹھ کر عاشق اپنی خانماں بربادی بلکہ آوارہ گردی کی بسم اللہ کرتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی زندگی "جی، آئی، پی۔ این، ڈبلیو، آر، اور اسی طرح کی نہیں معلوم کتنی ریلوں میں سفر کرتے گزر جاتی ہے۔ لیکن "پھر دیکھ لوں اک بار میں جلوہ ترا" کی تمنا کبھی پوری نہیں ہوتی۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اختر نے جھانسی کے اسٹیشن پر دہلی سے بمبئی جانے والی ایکسپریس کی ایک "ستمگر" کو دل دے ہی دیا۔ اختر

تھے تو ہمیشہ کے" ہو لو"، مگر ہم کو یہ اُمید نہ تھی کہ ان میں بھی عشق و محبّت کی صلاحیت موجود ہے۔ جب وہ حضرت ایکسپریس کے آنے کے بعد زنانہ درجہ کے سامنے بڑی دیر تک مُنہ اُٹھائے کھڑے رہے تو ہم اُن کی اس حرکت کو بھی "ہولوپن" سمجھتے رہے۔ لیکن جب ایکسپریس کے جانے کے بعد بھی وہ مجسّمہ بنے کھڑے رہے تو ہم کو ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں ان پر فالج تو نہیں گر پڑا ہے، کہیں ان کے قلب کی حرکت تو نہیں بند ہو گئی ہے، کہیں ان پر جادو کر کے کسی نے پتھر کا تو نہیں بنا دیا، کہیں یہ سردی کی شدت سے اکڑ تو نہیں گئے۔ یہاں تک کہ شبہات رفتہ رفتہ بڑھنے لگے اور ہم پر ایک خوف کی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ ان کو چھونے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ یہی سے کھڑے ہوئے آوازیں دے رہے تھے، اگر اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع دیتے تو اندیشہ تھا کہ کہیں لاوارث مال سمجھ کر ان کو مال گودام میں نہ ڈال دیا جائے، اور خود اس لئے نہیں چھوتے تھے کہ کہیں ہم بھی ایسے ہی نہ ہو جائیں، لیکن آخر یہ کب تک ہوتا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ اس بیچارے کو چھوڑ کر چلے جاتے، حالانکہ نئی روشنی کے دوستوں کا یہی فیشن ہے کہ وقت پڑنے پر بیگانہ بن جاتے ہیں، لیکن ہم اس کو ذرا شرافت سے بعید سمجھتے ہیں۔ لہٰذا دل مضبوط کر کے اُن کی طرف بڑھے

اور درود شریف وغیرہ پڑھ کر اُن کے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک پڑے اور اُن کے چونکنے سے ہم اُچھل پڑے۔ انہوں نے ایک "زمہریری سانس" کھینچ کر کہا "کیا ایکسپریس چھوٹ گئی؟" ان کے اس سوال سے ہم کو اندیشہ ہوا کہ بے چارے کا دماغ خراب ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہ کہیں حملہ نہ کر بیٹھیں کہا:۔

"کیا تم سو رہے تھے؟"

اختر "کیا تم سو رہے تھے؟"

میں "یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم سو رہے تھے، جو ایکسپریس کے چھوٹنے کی خبر بھی نہ ہوئی"

اختر "واقعی میں سو رہا، میں نے خواب دیکھا ہے وہ خواب ہی تھی وہ خواب تھی"

میں "عجیب چیز ہیں آپ بھی یعنی گھنٹہ بھر سے منہ اُٹھائے کھڑے ہیں گویا بنا کر کھڑے کر دیئے گئے ہیں"

اختر "ہاں بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوں دیوانہ بنا کر، سودائی بنا کر، وحشی بنا کر، مجنوں بنا کر"

بیس :- پاگل تو ہو ہی اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے، آخر تم ہی بتاؤ یہ کونسی ادا تھی ؟"

اختر :- ادا، ہاں ادا تھی جو میری قضا بنے گی اور جس کو میں لقا سمجھوں گا۔"

اب تک تو ہم مرد بنے ان کی اوٹ پٹانگ باتیں سُنا کئے لیکن اب ایسی دہشت طاری ہو چکی تھی کہ اگر وہ ہماری طرف بڑھتے تو ہم چیخ مار کر یا تو بھاگ جاتے یا بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے ۔ لیکن ہم نے اپنے کو اور بھی مضبوط کیا اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر ذرا تھرائی ہوئی آواز سے دریافت کیا :-

" یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو "

اختر :- اچھا وہ کون تھی ؟"

بیس :- کون ؟"

اختر :- اچھا وہ کون تھی ؟

بیس :- کون ؟"

اختر :- وہ جو گئی ہے ۔"

بیس :- وہ بمبئی دہلی ایکسپریس تھی ۔"

اختر "یہ نہیں وہ غارت گرِ ایمان جو اس میں بیٹھی تھی جو مجھ کو اپنا بنا کے یہیں چھوڑ گئی جو چلتے وقت مجھ سے ملی بھی نہیں۔ جس نے ادھر رُخ بھی نہ کیا جو مجھ کو اپنا بنا کر جانتی بھی نہیں۔ ۶

"ہائے جسے خبر نہیں کچھ مرے حالِ زار کی"

میں "کیا ہوا کیا؟ کس کو تم کہہ رہے ہو۔ میں ابھی نہیں سمجھا"

اختر "وہی میرے دل کی مالکہ"

میں "کیا کوئی عورت تھی"

اختر "ہاں ایک کافرہ تھی، ایک حور تھی، ایک مست شباب تھی جس کی ایک بہکی ہوئی نظر میرا دل چھین لے گئی، اور جس نے مجھ کو تڑپا کر ایک نظر بھی نہ ڈالی"

میں "استغفراللہ اتنی دیر کے بعد اب ہم سمجھے کہ آپ پر عشق کا بھوت سوار ہے اور اس خطرناک عشق کا جس کو ہم مہلک ترین عشق یعنی "ریلوے عشق" سمجھتے ہیں"

خیر ہمارا خوف تو دور ہوا مگر بیچارے اختر کی حالت پر ہم نے افسوس ہی نہیں کیا بلکہ انا للہ و انا الیہ راجعون بھی پڑھ دیا۔ اس لئے کہ اب ہماری

نظروں کے سامنے ان کا مستقبل موجود تھا، اور ہم جانتے تھے کہ اگر واقعی ان حضرت نے دل دے دیا ہے تو اب ان کا علاج پاگل خانہ میں بھی نہیں ہو سکتا۔ ہم اُن کے قریب آئے اُن کے سر سے ٹوپی اُتار کر ہوا دی۔ لیکن جب وہ ہوا لگنے سے سردی کی شکایت کرنے لگے تو ہم نے ان کو تسلّی دی۔ کامیابی کے سبز باغ دکھائے اور دل بہلانے کی ترکیبیں کرتے رہے لیکن وہ یہی پوچھا کئے کہ "آخر وہ تھی کون ؟"

(۲)

عشق کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں کہ دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کہیں اور وہ چلا گیا جو لے چار ے ان عاشقوں کو زندگی بھر سمجھاتے ہیں۔ انہیں کا دل خوب جانتا ہوگا کہ ان لوگوں سے کتنا سر کھپانا پڑتا ہے اور یہ لوگ سمجھانے سے کتنا سمجھتے ہیں۔ واللہ عجیب بات ہے کہ یہ عاشق لوگ جو بات کہی جائے اس کا اُلٹا ہی مطلب ہمیشہ سمجھا کرتے ہیں اور سمجھانے والے سے بڑھ کر دنیا میں ان لوگوں کا دشمن اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس کو "ناصح ناداں" کہتے ہیں۔ اس کو اپنی زبان میں طرح طرح کی مہذّب گالیاں دیا کرتے ہیں۔ اور اس سے ایسا جلتے ہیں، گویا یہ بھی رقیب ہے۔ تقریباً یہی حال ہمارا تھا کہ ہم اپنے

تو گرفتارِ عشق اختر کو سمجھانا چاہتے تھے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ہمارا دوست ہے اور مجمع احباب میں اس کو وہی درجہ حاصل ہے جو تاش کی گڈی میں جوکر کو، یا تھیٹر میں کومک کو یا اخباروں میں پنچ اخبارات کو حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں وہ عشق کا دیوانہ بن کر جان پر کھیل گیا تو ہمارا لطف زندگی بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن وہ حضرت ہمارے اس جذبہ کی قدر یہ فرما رہے تھے کہ ہم کو خود غرض، ابن الوقت، احمق، طوطا چشم، غیر ہمدرد، نامعقول، بے وقوف، اور اس قسم کی خلتی معزز گالیاں ہو سکتی ہیں، سب دے رہے تھے۔ وہ تو کہیئے کہ ہم ان کو مرفوع القلم سمجھ چکے تھے، ورنہ یہ عشق وشق تو سب دھرا رہ جاتا، پلیٹ فارم پر اچھی خاصی فوجداری ہو جاتی۔ اور انصاف سے دیکھئے تو فوجداری کی بات بھی تھی کہ آپ کسی شریف آدمی کو برا بھلا کہیں اور وہ خاموش رہے یہ کیسے ممکن ہے، ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے تو ان سے کہا کہ بھائی جو کچھ ہونا تھا ہوا، اگر وہ ہوتی تو پولیس وغیرہ کے سپرد کر دیتے اور اگر اُس کے پاس سے تمہارا دل برآمد کر لیتی تو تم کو دل مل جاتا اور اس کو سزا ہو جاتی لیکن اب تو وہ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اب جانے دو، چھوڑو اس غصہ کو اور چلو گھر "۔ اب بتایئے کہ ہم نے ان سے کون سی غیر شریفانہ بات

کی، لیکن وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے "آپ کی ہمدردی کا شکریہ، آپ تشریف لے جائیے میں آجاؤنگا۔ سچ ہے ؎

جس پہ گزری ہو یہ وہی جانے
جو کہ بیدرد ہو وہ کیا جانے

میں "تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں؟ جو کہو وہ کروں، اب تو جو کچھ گزرنا تھی گزر چکی، اب صبر کرو خداوند کریم نعم البدل دے گا"

اختر "نعم البدل، اور اس کا، ناممکن ہے، اور اگر ممکن بھی ہو تو مجھ کو منظور نہیں"

میں "اچھا تو پھر اب کیا کیا جائے"

اختر "کچھ نہیں، بس مجھ کو چھوڑ دو، میں اسی طرف جاؤنگا جدھر میرا دل لے جایا گیا ہے"

میں "یعنی ریل کی پٹڑی پٹڑی چلے جاؤ گے اچھا پھر"

اختر "مجھ کو پھر کے بعد کچھ نہیں معلوم، بہرحال مجھ کو چھوڑ دو"

میں "ذرا صبر سے کام لو دیوانگی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا"

اختر "بھائی صاحب تو آپ اپنی صحیح الدماغی کو لئے دولت کدہ تشریف

لے جائیں ، مجھ کو میری قسمت پر چھوڑ دیں ۔"

میں " اچھا میں نے چھوڑا تم کو ۔ اب بتاؤ تم کیا کرو گے ؟"

اختر " میں اسی طرف کو جاتا ہوں جدھر ایکسپریس گئی ہے اور اُس کے لئے جاتا ہوں جس کا پتہ و نشان بھی مجھ کو نہیں معلوم ۔"

میں " اچھا تم مجھ کو آدھ گھنٹہ دو کہ میں اپنے حواس بجا کر کے شاید کوئی ترکیب نکال سکوں ۔"

اختر میری بات پر راضی ہو گئے اور میں نے یہ طے کرنے کے بعد کہ اُن کی ضد پوری کر دی جائے ۔ یہ فیصلہ کیا کہ دوسری بمبئی کی طرف جلنے والی گاڑی پر تھوڑی دُور تک اُن کو سیر کرا دی جائے ۔ لہٰذا میں نے ٹائم ٹیبل میں وقت دیکھا اور اس سے اور بھی اطمینان ہُوا کہ گھنٹہ بھر بعد میل ٹرین چھوٹے گی جو ایکسپریس کو بینیا کے جنکشن پر پکڑ لیتی ہے ۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا کہ بینیا تک جانا چاہیئے اور وہاں یہ حضرت اپنی محبوبہ کی زیارت بھی کر لیں گے ۔ مَیں نے ان کو واپس آ کر یہ مژدہ سنایا ، مگر وہ تو مجھ کو ہمیشہ کا جھوٹا نہ سہی تو کم از کم اس عشق کے آغاز سے تو جھوٹا ہی سمجھنے لگے تھے ۔ لہٰذا وہ اس خوشخبری کو ایک غلط تسلّی سمجھے ، لیکن جب میں نے اُن کے علاوہ اپنی بھی قسم کھائی ، تو اُن کو

اطمینان ہوا اور اب اُنہوں نے اپنا رُخ بجائے جانے والی گاڑی کے آنے والی گاڑی کی طرف پھیر دیا۔ یہ پہلی حرکت تھی۔ جو صبح سے اب تک انہوں نے کی، اس کے علاوہ باقی تمام حالات بدستور تھے۔ کبھی آہ سرد بھرتے تھے کبھی ؎

ترے تیر نیمکش کو کوئی میرے دل سے پوچھے

گنگناتے تھے اور کبھی ایک چشم غضب اس ناکردہ گناہ پر بھی ڈال دیتے تھے ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر ہم نے دل لیا ہوتا، یا ہم نے دل لینے والی کو بھڑکا کر اُن کا دل اُڑا دیا ہوتا یا ہمارا کسی طرح اس معاملہ میں دخل ہوتا تو ایک بات تھی، لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم بے خطا ہیں وہ حضرت ہم کو اس طرح دیکھ رہے تھے، گویا سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ ہماری ہمدردی ملاحظہ فرمائیے، کہ ہم نے چائے پیش کی۔ لیکن اس کا جواب بجائے شکریہ کے ایک حقارت آمیز چیں بجبیں سے دیا گیا۔ بلکہ جب ہم نے مع توسٹ کے چائے کی پیالی بڑھائی، تو حضرت اس زور سے جھڑک کر بولے کہ چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی، مجبوراً ہم نے خود چائے پی لی اور چپ ہو کر بیٹھ رہے ۔۔۔۔۔ اُن کو ہر طرح کا اطمینان تھا کہ اب چلیں گے

اور وہ نظارہ بھی حاصل ہو جائے گا جس کے لئے وہ پھڑک رہے تھے لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اُن کا یہ حال ہوتا جاتا تھا گویا کسی سخت قسم کا دورہ شروع ہو گیا۔ اُلجھی ہوئی سانسیں لے کر گھبرائی ہوئی آنکھوں سے ہر طرف اس طرح دیکھتے تھے، گویا کسی کو قتل کر کے بھاگنے کی فکر میں ہیں۔ کم از کم اُن کی وہ خوفناک صورت دیکھ کر میں تو سہم ہی گیا تھا۔

اب اُن حضرت کو مجھ سے ایک نئی شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ میں ہی گاڑی کی آمد میں تاخیر کا باعث ہوں، کئی مرتبہ ڈانٹ کر مجھ سے پوچھا "گاڑی کب آئے گی" جب میں نے کہا کہ "اپنے وقت پر آئے گی" تو مجھ کو اور بھی کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اب کیا آئے گی" "وہ کیوں آنے لگی"! لیکن خدا کا شکر ہے کہ گاڑی نے آکر میری جان بچائی اور ان کے ساتھ میں بھی گھبرا کر اپنے سامنے والے ڈبہ میں چڑھ گیا جو اتفاق سے اسباب وغیرہ کا ڈبہ نہ تھا۔ آدمیوں کا ڈبہ تھا ورنہ معلوم نہیں اسباب کے ڈبہ میں گھسنا پڑتا یا گارڈ کے ڈبہ میں؟ اس لئے کہ ان کی وحشت مجھ کو بھی بغیر دل کھوئے ہوئے نیم وحشی بنا چکی تھی۔

(۱۳)

بمبئی میل کی رفتار سے میرے تخیلات کی رفتار اور میرے تخیلات کی رفتار سے تیز اختر کی وحشت کی رفتار تھی۔ ہم دونوں خاموشی کے ساتھ ریل کی چھک چھک کے سروں پر اپنے تخیلات کے نغمے اتارتے ہوئے سفر طے کر رہے تھے، کہ یکایک مجھ کو ٹکٹ نہ خریدنے کا خیال پیدا ہوا اور یقین جانیئے کہ تمام بدن کا خون جو اختر صاحب کی وحشت سے بچ رہا تھا اس بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے خشک ہو گیا۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا، اگر اختر سے کہتے تو ڈر تھا کہ ہمارے دوسرے ہم سفر نہ سن لیں، اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی ریلوے ملازم ہو جو ہم کو اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ کے دام مع جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ بم سازی کے شبہ میں پولیس کے سپرد کر دے۔ دوسرے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اختر کہیں زنجیر نہ کھینچ لے کہ بیٹھے بٹھائے پچاس روپیہ جرمانہ ادا کرنے کے لئے ہم کو اپنے اور اختر کے کپڑے بیچنا پڑیں لہٰذا ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن صورت تو ایسی ہو گئی گویا اپنے کسی شریکِ سفر کا لوٹا چرانے کے بعد پکڑے گئے ہوں اور خود اس پر شرمندگی ہم کو سر نہ اٹھانے دیتی ہو۔ ہم اسی چکر میں تھے کہ اب کیا ہو گا کہ اختر نے

چونک کر پوچھا "کیا بلینا آگیا؟"

میں :- "ابھی کہاں سے آیا یہ تو للت پور ہے اب آئیگا بلینا"

اختر :- "خدا جانے کب آئیگا؟ کیا ہمیشہ اتنی ہی دیر میں بلینا آتا تھا یا آج گاڑی سُست چل رہی ہے؟"

میں :- "تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ اب جلدی کیا ہے۔ اس کے بعد بس بلینا ہی سمجھو"

اختر :- "آج گاڑی کو یقیناً مجھ سے ضد ہو گئی ہے۔ ورنہ اتنی دیر نہ لگتی میرا دم اُلجھ رہا ہے۔ میں پریشان ہوں مجھ سے وقت نہیں کٹتا"

یہ کہہ کر اختر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور میں بھی اس طرح اُن کے ساتھ ساتھ کھڑا ہو گیا گویا ہم دونوں میں ایک ہی اسپرنگ لگا ہوا تھا۔ میں نے اختر سے بیٹھ جانے کو کہا اور معلوم نہیں کیوں اختر نے میری ہدایت پر عمل کیا، میں بھی بیٹھ گیا اور اختر کے دل کو اِدھر اُدھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ "اختر دہی بڑے کھاؤ گے؟"

اختر :- "نہیں"

میں :- "للت پور کے دہی بڑے اور پاپڑ تمام ہندوستان میں مشہور ہیں"

اختر: "نہیں"

میں: "نہیں کیا" واقعی مشہور ہیں۔ تم کھا کر تو دیکھو یاد کرو گے مزا"

اختر: "نہیں"

میں: "اچھا پاپڑ کھا لو"

اختر: "نہیں"

اب میں نے گفتگو کا رُخ بدل کر کہا: "تمہارے والد للت پور میں رہ چکے ہیں اور تمہارا بچپن یہیں گزرا ہے۔ جب تم چھوٹے سے تھے اور تم کو ضعف معدہ کی شکایت تھی تو یہاں کے ایک بوڑھے سے حکیم جن کا بھلا سا نام تھا یاد نہیں آتا تمہارے معالج تھے اور انہوں نے تم کو فاقہ پہ فاقے دلوائے، تم بہت کمزور ہو گئے تھے اور بدنیت بھی۔ ہر وقت کھانے کے لئے روتے تھے۔ ہم تو اس وقت بڑے سے تھے اور تم کو بہت چھیڑا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تمہاری ٹانگوں میں گھس کر جو ہم کھڑے ہوئے تو تم بڑی زور سے گرے اور تمہاری پیشانی پہ زخم بھی آ گیا۔ اُس دن تمہارے والد ہم پہ بہت خفا ہوئے اور تم سے کہا تھا کہ اس شریر کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ مگر تم نے بچپن دوسرے ہی دن پھر اس طرح ہم دونوں گلے مل گئے گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا

تم کو معلوم ہوتا ہے کچھ یاد نہیں ؟"

اختر "نہیں "

اب ہم نے دیکھا کہ اس شخص نے "نہیں" کہنے کی قسم کھائی ہے تو اس سے ایسی گفتگو کی جائے کہ یہ "ہاں" بھی کہے تاکہ اس کے بعد کوئی اور امکان پیدا ہو۔ لہذا ہم نے ڈھونڈھ کر ایسا جملہ کہا کہ "ہاں" کے علاوہ کچھ نہ کہا جا سکے۔

اختر "اُدنہہ"

اب تو ہم اور بھی پریشان ہوئے کہ یہ "اُدنہہ" تو "نہیں" سے بھی زیادہ خطرناک جواب ہے۔ اس لئے کہ بعد والا درجہ خاموشی ہے لہذا ہم کو ذرا فکر پیدا ہو گئی لیکن فوراً ہی ہم کو خیال آیا کہ ان سے اُسی کے متعلق سوال کئے جائیں جس میں یہ کھوئے ہوئے ہیں اور واقعی یہ سوالات ضروری بھی تھے۔

لہذا ہم نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا:-

"تم وہاں اس کو پہچان لوگے ؟"

اختر "اس کو میں یہیں سے پہچان رہا ہوں۔"

میں "یہاں سے تو خیر پہچان رہے ہو مگر وہاں کس طرح پہچانو گے۔ اُس کی پہچان کیا ہے ؟"

اختر۔ "جس کی طرف مجھ کو جھانسی سے کشاں کشاں لایا جا رہا ہے وہ بینا میں بھی مجھ کو اپنے قریب کھینچ لے گا۔"

میں۔ "مگر مجھ کو تو پہچان بتاؤ کہ کیسی صورت تھی، کیا وضع قطع تھی تاکہ میں بھی پہچان سکوں۔"

اختر۔ "صورت میں نے دیکھی نہیں بس ایک بجلی سی چمک کر میری آنکھوں کو چھپکا گئی، اور میں تاب نظارہ نہ لا سکا۔"

میں۔ "کچھ لباس وغیرہ کے متعلق بتا سکتے ہو۔"

اختر۔ "ہاں شاید ریشمی پیازی رنگ کی ساری تھی اور بالوں میں اُسی رنگ کا ریشمی فیتہ تھا۔"

میں۔ "بظاہر مسلمان معلوم ہوتی تھی یا کوئی اور۔"

اختر۔ "کافرہ تھی کافرہ۔"

میں۔ "یعنی مسلمان نہیں تھی، اچھا کچھ اور بتاؤ۔"

اختر۔ "میں کیا بتاؤں ایک برق مجسّم تھی ایک شعلۂ لرزاں تھی، ایک وحدتِ مطلق تھی، ایک کفر سراپا تھی۔"

میں۔ "ان پہچانوں سے تو میرے فرشتے بھی کسی کی شناخت نہیں کر سکتے۔

ایسا پتہ ہے ـــــ بینا جنکشن دُور سے نظر آنے لگا اور میرے منہ سے نکل گیا کہ بینا آگیا۔

یہ سُنتے ہی اختر اس بیتابی سے کھڑکی میں جھکے کہ مجھ کو اُن کا بازو پکڑ لینا پڑا، کہ کہیں گر نہ پڑیں یا چھلانگ نہ ماریں"

(۴)

بیناؔ کے اسٹیشن پر اخترؔ تو بیتابی کے ساتھ اُتر گئے۔ لیکن ہم کو اپنے پاس ٹکٹ نہ ہونا پھر یاد آگیا اور ہم اپنے کو چھپاتے ہوئے اُترے۔ لیکن بہ یک بینی دو گوش تھے۔ لہٰذا یہ جھوٹ بولا جا سکتا تھا کہ ہم مسافر نہیں ہیں کسی کو سوار کرانا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک ہمارے بچنے کا امکان تھا۔ گاڑی سے اُتر کر دوسری گاڑی کی تلاش میں چلے، آگے آگے اختر تھے اور پیچھے پیچھے ہم، اخترؔ تو آنکھیں پھاڑے منہ کھولے ایک طرف کو چلے جا رہے تھے، اور ہمارا یہ حال تھا کہ جو عورت نظر آتی تھی ہم بڑھ کر اختر سے پوچھ لیتے تھے کہ "دیکھو یہ تو نہیں ہے"، لیکن اختر ہمارے اس سوال کا جواب دینا بھی غیر ضروری سمجھتے تھے اور بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے اس بے تکے پن کو ناجائز سمجھ کر ایک قلی سے پوچھ لیا کہ ایکسپریس کہاں ہے اور صحیح پتہ معلوم

کرنے کے بعد اختر کو لے کر دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچے جہاں ایکسپریس
موجود تھی، اختر نے بیتابی کے مارے دو تین سیڑھیاں اُترنا بھی مناسب نہ سمجھا
اور مجھ کو پکڑ کر اس طرح پھاندے کہ اگر ذرا میں نہ سنبھلتا تو خود مع اختر صاحب
کے ایک پان والے پر اس طرح گرتا کہ منہ ٹوٹ جاتا ورنہ پان والا توڑ دینا
چلتے چلتے اختر ٹھہر گیا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر کہنے لگا۔

"وہ ہے میرا مرکزِ نظر وُہ ہے"

میں نے بھی اُس کی اُنگلی کی سیدھ میں بندوق کے نشانہ کی طرح
شِست باندھ کر دیکھا، تو ایک پیازی رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی نازنین
کی پشت دکھائی دی، جس پر لمبے لمبے ریشمی بال ایک پیازی رنگ کے
فیتے سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکوں سے بل کھا رہے تھے اور ساری
میں ہوا نے ایک متوجی کیفیت پیدا کر دی تھی، وہ نازنین ایک سیکنڈ
کلاس میں بیٹھی تھی، اور بظاہر یا تو پارسن تھی یا عیسائن۔ میں دیر تک اس
کو دیکھتا رہا۔ اختر کا تو وہی حال ہو گیا جو جھانسی کے اسٹیشن پر تھا۔ معلوم
ہوتا تھا کہ آپ کو نصب کر دیا گیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اس شخص کی آنکھیں
بھی پتھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ کیا مجال جو ایک مرتبہ بھی جھپکی ہوں۔ جب اسی

عالم میں کافی دیر ہو گئی تو میں نے کہا :-

"اب جا کر قریب سے دیکھ لو، نہیں تو ریل چھوٹ جائے گی"

اختر "ہوں"

میں "ہوں کیا، دیکھنا ہے تو دیکھ بھی لو۔ صورت ہی نہ دیکھی تو کیا دیکھا"

اختر "مگر میں دیکھ نہ سکونگا۔ بغیر دیکھے میرا یہ حال ہے۔ شاید دیکھ کر میں زندہ نہ رہ سکوں گا"

میں "نہیں دیکھ لو۔ چلو میں بھی چلتا ہوں اُدھر سے دیکھیں گے"

اختر خود تو نہیں چلے، چلائے گئے۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کر آگے بڑھا دیا، اور وہ ڈگمگاتی ہوئی چال سے آگے بڑھے ہم دونوں چکر کاٹ کر اس رُخ پر پہنچے جدھر اختر کی مطلوبہ کا رُخِ روشن تھا، لیکن اُدھر سے جا کر دیکھا تو اُدھر بھی پشت ہی تھی۔ غالباً اس عرصہ میں اُس نے اپنا رُخ بدل دیا، یا اس کے دونوں رُخ یکساں تھے۔ بہرحال ہم دونوں پھر اپنی پہلی جگہ پر واپس آئے۔ اس مرتبہ اس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ لیکن میں نے غیر ارادی طور پر گردن جھکا لی، غالباً اس لئے کہ پرائی چیز تھی اور اختر نے اس لئے آنکھیں چار نہ کیں کہ کلوروفارم کے اثرات کا اندیشہ تھا۔ لیکن

میری گردن ایک دم سے اختر کے "اوہے" کہنے سے اوپر اٹھی اب جو دیکھتا ہوں تو ایک پچپن سالہ بڑی بی چیچک کے نقش چہرے کو ہماری طرف اٹھائے نہایت محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور غالباً اختر کی رُوح قفسِ عنصری سے عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گئی ہو گی دیر تک ہم دونوں مُنہ کھولے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے آپس میں ایک دوسرے کی نقل اُتار رہے ہیں اور جب ہوش بجا ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اس طرح پیٹھ موڑ لی گویا۔ ع۔

تم اپنا مُنہ اِدھر کر لو ہم اپنا مُنہ اُدھر کر لیں

کی مشق کر رہے ہیں۔ میں نے احتیاطاً پھر اُن بزرگ کے قریب جا کر اُن کو اس لئے دیکھا کہ کہیں یہ کوئی اور نہ ہوں۔ لیکن دراصل یہ وہی برقِ مجسّم، وہی شعلۂ لرزاں، وہی وحدتِ مطلق اور وہی کفر سراپا تھیں، جن کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ اختر کا یہ حال تھا کہ ایک چپ لگ گئی تھی، میرے سامنے مُنہ بھی نہ کرتا تھا اور مجھ کو اختر کے "ہولو بن" پر ایسا غصّہ آ رہا تھا کہ اگر اپنی اولاد ہوتی تو عاق کئے بغیر نہ چھوڑتا مگر "دیوانہ تو دیوانہ" کرتے تو کیا کرتے۔ آخر میں نے بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ کہا کہ دل دینے سے پہلے دیکھ لینا

چاہیئے کہ کس کو دیا جا رہا ہے اور عشق کرنے کے لئے تعین عمر لازمی ہے۔"

اختر نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر پیٹھ موڑ لی۔ اور میں واپسی کیلئے ٹرین کا وقت دیکھنے ٹائم ٹیبل کی تلاش میں بک اسٹال کی طرف چل دیا، معلوم نہیں کہ ایکسپریس کب چھوٹی۔

صدرِ مشاعرہ

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہزاروں مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہُوا ہے اور سینکڑوں قسم کے صدر، ان مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے اس مختصر سی عمر میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ مشاعرے خواہ محض مشاعرے ہوں یا ان کی تقریبِ انعقاد کچھ اس قسم کی ہو کہ دخترِ نیک اختر کی شادی کتخدائی ہے اور محفلِ رقص و سُرود گرم کرنے میں اخراجات بھی زیادہ ہیں اور شرعی سقم بھی نکل رہا ہے لہٰذا بجائے اربابِ نشاط کے بلانے کے شعرائے کرام کو بُلا لیا، چہل پہل بھی رہی، ادبی خدمت بھی ہو گئی اور خرچ بھی بس واجبی سا ہو گیا۔ بہر حال وہ مشاعرہ خواہ

اولادِ نرینہ کی پیدائش کی خوشی میں ہو یا بندہ زادہ کی خانہ آبادی کے سلسلے میں، لیکن ہوتا ہے باقاعدہ مشاعرہ۔ اور اس کا ایک صدر بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہ صدر عام طور پر کچھ یکساں قسم کے ہوتے ہیں یعنی مسند پر جہاں ایک گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے، گلدستے آراستہ ہیں، مائیکروفون آویزاں ہے وہاں ایک صدر بھی رکھا ہوا ہے۔ یہ صدر زیادہ تر نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں بس ہار پہنے بیٹھے پان چباتے رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مسندِ صدارت پر مصرعۂ طرح رکھا ہوا ہے۔ خواہ مشاعرہ غیر طرحی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ بعض صدر ایسے ہوتے ہیں جو خطبۂ صدارت پڑھنے آتے ہیں اور پھر فوراً ہی اس خیال سے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر چلے جاتے ہیں کہ کہیں ان شاعروں کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خطبۂ صدارت کسی اور کا لکھا ہوا تھا۔ صاحبانِ صدر کی ایک قسم وہ ہے جو اپنے عطیہ کا اعلان کرنے کے لئے مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوتی ہے اور پھر کسی ایسے مرض میں مبتلا ہونے کا بہانہ کر کے رخصت ہو جاتی ہے جو متعدی ہو۔ اور جس سے تمام حاضرینِ مشاعرہ کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آئے۔

لیکن آجکل لاہور میں مشاعرے کے صدر کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے جس نے "مشاعرہ" کو "مصادرہ" سا بنا کر رکھ دیا۔ ممکن ہے کہ مشاعرے کے عادی

اس "مصادرہ" کو نہ سمجھ سکیں لہٰذا اس کی تشریح ضروری ہے یہ بھی دراصل ایک قسم کا مشاعرہ ہوتا ہے مگر اس میں مشاعرہ کم اور صدر زیادہ ہوتا ہے۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے مگر ہم عرض کریں گے کہ ہو اس لئے سکتا ہے کہ ہم نے خود دیکھا ہے اور اس مصادرے میں شرکت کی ہے۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ، یہ اور بات ہے کہ اب ذرا پہلے ہی سے سونگھ کر دیکھ لیتے ہیں کہ یہ مشاعرہ ہے یا مصادرہ۔ بات یہ ہے کہ معلوم نہیں کیوں اس مصادرے میں شرکت کے بعد پہلے تو ہنسی آتی ہے۔ پھر طبیعت جھنجھلاتی ہے اس کے بعد دماغ چکرانے لگتا ہے۔ پھر اپنے شاعر ہونے پر غصّہ آتا ہے۔ تخلّص سے نفرت ہو جاتی ہے دوسرے شعراء کے کلام سے متلی ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں خود کشی کا ارادہ مصمّم ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ مشاعرہ کم سے کم ہوتا ہے اور صدارت زیادہ سے زیادہ۔ صاحب صدر ہر شاعر کے متعلق ایک مستقل خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہیں اور اگر مشاعرے میں پچاس شاعر ہیں تو گویا ان کے کلام کے علاوہ ہر شخص کو پچاس صدارتی خطبے بھی سُننا پڑتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ دماغ کہاں تک ٹھکانے رہ سکتا ہے۔

خیر یہ بات توضیح میں سے شروع ہو گئی عرض کرنا یہ تھا کہ صدر کی اس

نئی قسم کو دیکھنے کا اتفاق ایک ایسے مشاعرے میں ہوا جو ایک دوست نے کوئی مقدمہ جیتنے کے سلسلے میں منعقد کیا تھا۔ جس وقت ہم پہنچے ہیں صدرِ محترم ارشاد فرما رہے تھے۔

"قسم ہے ان آبلوں کی جو وحشتِ غربت کے ایک ایک کانٹے کو سیراب کرنے آئے ہیں، قسم ان کانٹوں کی جو آبلہ پائی کی لذتوں میں اضافے کا سبب بنے، قسم ہے ان لذتوں کی جو درد کو مٹھاس عطا کرتی ہیں۔ اور کرب کو خوشگوار بنا کر ہم کو درد آشنا بنا دیتی ہیں کہ ہم تو خود رنجور ہیں کلام رنجور ہمارے دل کی آواز ہے اور اسی آواز کے لئے ہم گوش بر آواز ہیں لہٰذا جناب رنجور ملتانی تشریف لائیں۔"

قریب ہی ایک صاحب سر پکڑے اس طرح بیٹھے تھے گویا باد بانی جہاز پر بیٹھنے کا پہلا اتفاق ہے اور دردِ سر میں مبتلا ہیں ہم نے سرگوشی میں دریافت کیا "یہ کیا ہو رہا ہے۔"

بیزاری کے ساتھ ان حضرت نے فرمایا "میرا سر ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں میں کیوں آگیا تھا یہاں۔ یہ آٹھواں خطبۂ صدارت ہے اور رنجور صاحب آٹھویں

شاعر ہیں جو خلش صاحب کے بعد پڑھنے آئے ہیں۔ لہٰذا خلش اور رنجور کے سلسلہ کو جناب صدر نے اپنے اس خطبہ سے ملایا ہے "

رنجور صاحب غزل شروع کر چکے تھے۔ اور جناب صدر ان کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے جھوم جھوم کر فرما رہے تھے۔

" پھر پڑھیں گے رنجور بھیا پھر پڑھیں گے۔ کیا شعر عطا ہوا ہے رات بھر پڑھیں گے "

اور رنجور صاحب بار بار پڑھ رہے تھے خدا خدا کر کے ان کی غزل ختم ہوئی اور جناب صدر نے مائیکرو فون کو اس طرح اپنی طرف گھمایا جیسے چوپال میں ایک کے پی چکنے کے بعد دوسرا پینے والا حقہ اپنی طرف گھماتا ہے اور پھر وہی خطبہ،

" مجھ کو ایک مصرعہ یاد آ رہا ہے کسی شاعر کا۔ ع

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

کلام رنجور کے نقش دل پر داغوں کی صورت میں نمایاں ہوئے ان داغوں نے عجیب گل کھلائے کہ داغوں کے باغ لہلہا اٹھے نکہت بار و نزہت افزا کہیں یاسمین کی مہک ہے تو کہیں نرگس آنکھ مچولی کھیل رہی ہے جہاں گل ہو وہاں بلبل

کیسے نہ آئے چنانچہ یہاں بھی بلبل موجود ہے۔ اگر جناب عندلیب سرحدی اب بھی تشریف نہ لائیں تو میں اس بہار کو خزاں ہی سمجھوں گا!"

اِن ہی صاحب نے جو سر نگوڑے بیٹھے تھے پہلو بدل کر لونڈیوں کی طرح بُد بُداتے ہوئے کہا "پھر وہ ہو جواب کسی مشاعرے میں جائے!"

مگر ساتھ ہی ساتھ مجمع سے ایک آواز بلند ہوئی۔ کیا کہنا ہے جنابِ صدر کے اندازِ تعارف کا!"

اور جنابِ صدر نے مائیکروفون میں پھر اپنے نزدیک ٹکسالی شہد ٹپکا دیا "حسنِ سماعت ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔ من آنم کہ من دانم!"

ایک اور آواز بلند ہوئی "چوں وانی تکبّر چرا می کنی!"

ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اور اس شور کی تہ میں جناب عندلیب سرحدی کی آواز تیر رہی تھی اور جناب صدر اس مرتبہ بجائے شلوکے شانے پر ہاتھ رکھنے کے اس کا زانو سہلا رہے تھے۔

"پھر عطا ہو گا۔ نازک بات کہدی ہے۔ پھر پڑھیں گے بھیّا عندلیب!"

اور بھیّا عندلیب اسی طرح پڑھتے پڑھتے اپنے مقطعے تک پہنچ گئے۔ لیجیے پھر جنابِ صدر نے مائیکروفون گھسیٹ لیا۔

"بلبل چہک چکا، پھول جھوم چکے، نزہت تیر چکی۔ مگر یہ کسی نے نہ سوچا ہوگا کہ جو نیا باغ ہم نے لگایا ہے اس کو ہم نے کتنی قربانیوں کے بعد لہلہانے کے قابل بنایا ہے اس کو ہم نے اپنے خون سے سینچا ہے اس کو ہم نے سب کچھ کھو کر حاصل کیا ہے اور اس کا نام پاکستان رکھا ہے۔ اب یہی ہمارا آخری سہارا ہے اس کے تحفظ کے لئے ہم کو خواب غفلت سے ہوشیار ہونا پڑے گا۔ اللہ کے بعد ہم ہی کو اس کا حافظ اور نگہبان بننے کے لئے ہوشیار اور بیدار ہونا پڑے گا لہذا کیوں نہ کسی حفیظ سے ہوشیاری کا پیغام سن لیجئے اگر اب بھی جناب حفیظ ہوشیارپوری تشریف نہ لائے تو اس گلستاں کا خدا ہی حافظ۔"

اُن جان سے بیزار صاحب نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے فرمایا "نہ جایئے حفیظ صاحب، کہہ دیجئے کہ میں کوئی ہوشیاری کا پیغام نہیں سنا سکتا۔"

مگر حفیظ صاحب تالیوں کے تھپیڑوں میں تیرتے ہوئے مائیکروفون کے

پاس آ گئے اور فرمایا "ہوشیار اور بیدار کرنے کے لئے تو جنابِ صدر کی جادو بیانی کافی ہے۔ میں تو غزل کے چند شعر پیش کرتا ہوں"

یہ شاعر ذرا باغی نکلا جب جناب صدر نے نعرہ بلند کیا "بہت اچھا پھر پڑھئیں گے" وہ دوسرے شعر پر پہنچ گیا اور جب جناب صدر اتفاق سے چپ رہ گئے اس نے شعر مکرر پڑھ دیا۔ یہاں تک کہ غزل کے گیارہ اشعار میں اس نے جناب صدر کو گیارہ مرتبہ اندازہ کرایا کہ ان کا صدارتی اقبال کم سے کم اس شاعر کے معاملہ میں ان کی یاوری نہیں کر رہا ہے اور آخر وہ تھک کر خاموش ہو گئے یہاں تک کہ جب شاعر نے غزل ختم کی جناب صدر اس کے نام سے دوسرے شاعر کا سلسلہ ملانے میں بھی ناکام رہے۔ اور آپ نے ایک اور ہی قسم کا اعلان فرما دیا۔

"سامعین کرام اب آپ کے سامنے وہ شاعر شیریں مقال آرہا ہے جس کے نام کا پہلا حرف الف ہے۔

جو صاحب جان سے بیزار بیٹھے تھے برجستگی سے بولے "الف سے انڈا"

جناب صدر فرما رہے تھے "نام کا پہلا حرف الف ہے اور اللہ کی قسم یہ الف قسم کھا رہا ہے اس آفتاب تاباں کی جس کو خاور بھی

کہتے ہیں خاور شاعر کے نام کا دوسرا حرف ہے کہ طلوع ہوتا ہے
یعنی خے۔

ہم نے قریب بیٹھے ہوئے صاحب سے پوچھا "کیا ہو سکتا ہے یہ نام الف اور خے۔
وہ جل کر بولے "اختروٹ"!

جناب صدر کا سلسلہ جاری تھا "الف اور خے کے بعد شاعر کے نام کا تیسرا حرف اس توبہ کو توڑ رہا ہے جو کالی گھٹائیں بھی نہ توڑ سکیں اور آخری حرف اس زندگی دے سے لیا گیا ہے جس کی توبہ ٹوٹ چکی ہے یعنی الف خے زبر اَخ تے زے زبر تر۔
جناب اختر سہارنپوری"!

اب تو ہم نے بھی سوچنا شروع کر دیا۔ کہ یا اللہ یہ مشاعرہ ہے یا کچھ اور۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے مگر اسی مشاعرے میں ایسے ایسے صاحبانِ ذوق بھی بیٹھے ہوئے تھے جو جنابِ صدر کے ان ارشادات پر خوش ہو ہو کر تالیاں بھی بجاتے تھے اور داد بھی دیتے تھے اب یہ فیصلہ دشوار تھا کہ آخر وہ کیا سمجھ کر داد دے رہے ہیں اور آخر وہ خوبیاں ہم کیوں نہ سمجھتے۔ جو ان کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ آخر ہم نے قریب بیٹھے ہوئے صاحب سے دریافت کیا۔

"کیوں صاحب یہ لوگ جو ان اعلانات کی داد دے رہے ہیں کس قسم کے لوگ ہیں"

وہ حضرت بولے "مہاجرین"

ہم نے حیرت سے کہا "مہاجرین" مہاجرین سے کیا مطلب ہے آپ کا"

وہ بولے "جو ذوقِ سلیم اور عقل دونوں سے ہجرت کر کے اس مشاعرہ میں آگئے ہیں"

ہم نے ہنس کر کہا "وہ تو ٹھیک ہے ویسے مہاجر تو ہم اور آپ بھی ہیں مگر یہ داد کس بات کی دی جا رہی ہے"

وہ بولے "دنیا میں ہر قسم کی جہانیلزم اسی قوم کے ہاتھوں رواج پاتی رہی ہے"

جناب صدر کا نعرہ گونجا۔ بھائی اخترؔ تشنگی باقی ہے پھر فرمائیں گے یہ مقطع۔

اختر شماری کر اسے گا یہ مقطع اخترؔ بھیا"

اور اختر صاحب نے پھر اپنا مقطع پڑھ دیا۔ اب مائکروفون جناب صدر کی پٹنی میں تھا اور وہ نطق صدارت سے حاضرین کا ناطقہ بند فرما رہے تھے۔

"لیلیٰ شب اپنے ستارے ایک ایک کر کے بجھانے لگی۔ اختر شماری میں

مصروف عشاق کی دعائے سحر رنگ لانے لگی۔ سیاہی پھیکی پڑ گئی۔ ملیوں چھپائے باقی ستارے شبنم بن کر جاگنے والوں کی آنکھوں میں آ گئے۔ مشرق کا مطلع رنگ بدلنے لگا۔ اور سُرخی پیدا ہوئی جس کا نام ہمارے ایک رنگین نوا شاعر کا تخلّص ہے یعنی جناب شفق زیدی تشریف لائیں بھیّا شفق ؛

ہمارے پاس بیٹھے ہوئے صاحب نے کہا: "شفق تو مونّث ہے۔ پھر بھیّا شفق کیا معنی ؛"

مگر ہم بھیّا شفق کا کلام سُن رہے تھے۔ جن کی آواز ذرا پاٹ دار بھی تھی اور اس نتیجہ پر پہنچا رہی تھی کہ ایسٹیج ڈراموں کی۔ اگر اب بھی تجدید ہو جائے تو غالباً بہت زیادہ مایوسی نہ ہوگی جناب صدر پر ایک عالم وجدطاری تھا۔ کبھی شاعر کو گلے لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی اپنے کو اس کے گلے منڈھنے پر تُل جاتے تھے اور نعرے وہی حسب معمول۔

"پھر پڑھیں گے، رات بھر پڑھیں گے۔ عطا کریں گے، رات بھر عطا کریں گے۔"

جناب شفق کے بعد جناب صدر پھر ما بکرہ دونوں میں منہ ڈالکر شروع ہو گئے۔

"شفق کی یہ سُرخیاں یاد دلاتی ہیں اس خون کی جو ہمارے جانبازوں

کے لیئے پانی سے ارزاں ہوتا ہے جس میں ہمارے مجاہد شناوری کرتے ہیں۔ جس کی ہولی کھیل کر سرخرو ہوتے ہیں مگر تلوار کے یہ دھنی جو اس آن بان سے میدانِ کارزار میں آتے ہیں جب اپنے مولا کے حضور میں جاتے ہیں۔ تو ان کی عبادت ـــــ"

قریب بیٹھے ہوئے صاحب نے کہا "آئی پروفیسر عابد علی کی شامت"

ہم نے کہا "خوب بوجھے آپ"

جناب صدر فرما رہے تھے "دن بھر میدان جہاد میں تلوار کے جوہر دکھانے والے رات کو تسبیح و تحلیل میں اس طرح مصروف ہوتے ہیں کہ ان کے حجروں سے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی سی بھنبھناہٹ سنائی دیتی ہے ہم کو ایسے ہی مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی عابدوں کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت پروفیسر عابد علی عابد پوری کریں گے"

عابد صاحب نے نہایت وقار سے کھڑے ہو کر کہا "جناب صدر کی اس شگفتہ بیانی کی داد دیتے ہوئے میں عرض کروں گا۔ کہ میں طے کر چکا ہوں کہ میں کچھ نہ پڑھوں گا"

ہمارے قریب بیٹھے ہوئے صاحب نے بیساختگی میں ایک منفرد قسم کی تالی بجا دی۔ جنابِ صدر نے اصرار کیا۔

"کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں

آج عابد غزل سرا نہ ہوا

عابد بھیا اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی فرمائیں۔"

میزبان نے آکر اعلان کیا کہ کھانے کی میزیں تیار ہیں اور اس سے قبل کہ جنابِ صدر کوئی اختتامی خطبہ ارشاد فرمائیں لوگ ان کو مسندِ صدارت پر چھوڑ کر کھانے کی میز پر آ چکے تھے۔

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔ لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تُل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے۔ لیکن

باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے، کہ ریاض بیچارے اپنے لئے والد کا انتظام کیونکر کرتے۔ اُن کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑیگا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا۔ لہٰذا اُن کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے اُن سے جُدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والدِ ماجد کا انتقال خود اُن کے لئے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے۔ اس لئے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لئے جانا تھا۔ اُن سے اظہارِ ہمدردی کرنا تھا۔ جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلہ

میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا نہیں تھا کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہرحال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لئے آ چکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں بھی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لئے کہ خود ہم نے بہ نفسِ نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادے کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ ذہن پر زور دے کر یکجا کرنا شروع کر دیئے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ——— صبر کیجئے ——— جس کی چیز تھی اس نے لے لی ——— دُنیا کا یہی دستور ہے ——— مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ کیا علیل ہوئے تھے؟ ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے ——— آج وہ، کل ہماری باری ہے ——— خدا بخشے عجیب انسان تھے دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جُدا ہو گئے ——— کوئی نشانی بھی چھوڑی

ہے: "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" ——— مگر صبر کیجئے ——— اب رونے سے کیا ہونا ہے ——— ہر ایک پر یہ دن آنے والا ہے ——— دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش ——— کبھی نماز قضا نہیں کی ——— خدا نعم البدل دیگا ——— اپنے دل کو سنبھالئے ——— صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ——— حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے ——— بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ——— ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن، الٰہی عاقبت محمود گرداں ——— چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں"

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کر نہ لے اس کے لئے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہر حال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "اکسپرٹ" ہو گئے تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لئے جا رہے ہیں تمام راستہ بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہو گئی :-

"مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی، واللہ دل کو یقین نہیں آتا، عجیب سانحہ ہے عجیب حادثہ ہے، خداوندِ کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی ـــــ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجیے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا ـــــ حسرت اُن غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جس کی چیز تھی اُس نے لے لی ـــــ "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" ـــــ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، روحیں آزاد نہ ہوں جسم جو برباد نہ ہوں، ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن مر یں گے تو سلیقے میں ڈھل جائیں گے، وہ تو جنّت کا ایک پھل تھے ـــــ حوروں کی گود میں ہونگے۔ نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچے، فرشتہ صفت، محبّت کرنے والے، پڑھے لکھے، فخرِ خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے۔ مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا۔ مٹی دینے میں شرکت کرتا۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہو جاتا، مگر افسوس کہ آج وہ، کل ہماری باری ہے" چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السّلام علیکم۔

ریاض کے دروازے پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خطلے جایئے کی آواز دیں لیکن یاد آگیا کہ غم کا موقع ہے، فوراً اپنا چہرہ اداس بنا لیا اور مری ہوئی آواز کے ساتھ پکارا" ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم"!

انہوں نے اس کے جواب" وعلیکم۔ اس سلام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا۔ لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا۔ ہم تعزیت کے لئے آئے تھے۔ لہٰذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی۔ لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اُسکی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے۔ جب اسی میں بڑی دیر ہو گئی۔ تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں مجبوراً

ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیئے۔ جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہو گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں؟ کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ بس بات شروع ہونے کی دیر تھی، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے۔ کہ شروع کس طرح کریں، چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہؤا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آ کر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا "لاحول ولاقوۃ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لئے آئے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بُت سے بنے بیٹھے ہیں"! لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سرِ نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

"آپ کے والد ——— پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آگیا تو عرض کیا:۔

"آپکے والد ——— ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ:۔

"آپکے والد ——— آپکے والد ——— آپکے والد ——— خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا۔

لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو۔ لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد ——— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اُس کو انتقال کی خبر میں ہی نے سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم، مشیّت ایزدی میں کیا چارہ ہے، صبر کیجیئے اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— آپ کے والد تھے ——— جس پہ گذری ہو یہ وہی جانے مگر اب نہ روئیے ——— جانے بھی دیجئے ——— ہٹایئے بھی اس قصہ کو ——— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا، مگر گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سن رہا تھا۔ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پہ گردن اٹھا کر میرا منہ بھی دیکھ لیتا تھا۔

اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"باپ بھی دنیا میں عجب نعمت ہیں، بہت سے بیچارے اس ارمان میں مر جاتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو نہیں آسکتے۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچانا، یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے خدا بخشے عجیب انسان تھے، دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرض محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی نماز جنازہ تو ضرور ہو ہی گئی ہوگی"

ریاض نے مخنی آواز میں جواب دیا:۔

"جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی"۔

میں "خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دیگا اور قبر کا کیا ہوا ہوگا؟

ریاض "عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی"

میں "ہاں واقعی اور تم بیچارے کیا کرتے، تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہوں گے

دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا، اور بیماری کیا تھی؟"

ریاض "ارے بیماری کیا۔ ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے"۔

میں "ہاں صاحب بڑی مہلک بیماری ہے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔

ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا۔ کمبخت اب تو

عالمگیر ہوتی جاتی ہے۔ غم کا پیمانہ چھلک پڑا "بہت آگے گئے باقی جو ہیں

تیار بیٹھے ہیں" اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی؟"

ریاض "ایک تو میں ہی ہوں"

میں "(جلدی سے) "تم تو خیر ہو ہی۔ مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں۔ ارے

ہاں کیا تعجب ہے؟"

ریاض "۔جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے"

میں "یہی مطلب ہے میرا، اور ان کی بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟"

ریاض: "جی ہاں میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے"

میں: "ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ، صبر کیجئے اور آپ کے والد ماجد کی ماشاء اللہ کیا عمر تھی؟"

ریاض: "سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے"

میں: "افسوس صد افسوس۔ ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

ریاض نے مجھ کو کچھ اس نظر سے دیکھا گویا میں خیالبازی کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے۔ مگر میں نے مؤثر انداز میں کہا

"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے اور محبت کرتے تھے۔"

ریاض: "جی ہاں اُن کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا"

میں: "ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں۔ خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے۔ ہر ایک خوش۔ کبھی نماز قضا نہیں کی۔

ابھی تو نہ تھے اُن کے مرنے کے دن، خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟"

ریاض "جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے"

میں "گھبرایئے نہیں۔ جس خدا نے ان کو اُٹھایا ہے وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کریگا۔ دُنیا سرائے فانی ہے۔ عجب ذات شریف تھے مرحوم کبھی نماز قضا نہیں خود ان ہی کی قضا آ گئی۔ ع

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دُنیا کا یہی دستور ہے، دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟"

ریاض "جی ابھی تو نہیں ہوئی"

میں "(بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ"

ریاض "اس کا یہ کونسا موقعہ ہے بھلا؟"

میں "تو اب اور کون سا موقعہ آئیگا"

ریاض "اب خوش ہونے والا کون ہے جو تھے وہی نہیں ہے تو اب کیا ہوگی شادی؟"

ہیں " ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ جس کی چیز تھی اُس نے لے لی۔ مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں "

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ۔ ع

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بیچارے آخر کیا بیمار تھے۔ یہی نا کہ بس قضا آ گئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مر جائیں گے؟ مگر خدا کی مصلحت، اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے اب تم کو کون اس طرح چاہیگا۔ تمہارا محبت کرنے والا اُٹھ گیا۔ تم یتیم ہو گئے۔ تم پر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔ ع

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لیکر رونا شروع کر دیا۔ اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں۔ تمام الفاظ ختم ہو چکے۔ کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں؟ لیکن اگر انہوں نے پھر بھی رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا بس اب

بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا مگر پھر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روٹھے ہوئے دوست کو نہ چھوڑ۔ لہٰذا ہم نے کہا:۔

"بھائی رونے کے لئے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاء اللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہوگے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ تم کو مجھ سے کام لینا چاہیے۔"

ریاض کی ہچکیاں سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں تو ہم نے سب سے پہلی بات یہی کہی کہ "اچھا بھائی اجازت دو۔"

ریاض نے کہا "جائیے گا؟" ہم نے کہا "ہاں۔ السلام علیکم!"

ریاض کے یہاں سے اگر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کے یہاں کیئے تعزیت کے لئے روز چلا جایا کروں۔

سُناؤں تمہیں بات اِک رات کی

واللہ میں بزدل نہیں ہوں نہ لکھنؤ میرا وطن ہے۔ بلکہ میرا تعلق تو اُس خاندان سے ہے جس کی بہادری کے افسانے آج تک بزدلوں کو بہادر بنانے کے کام آتے ہیں لیکن بعض واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی لرزہ بر اندام ہو جائے بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جو واقعہ ہم پر گذرا ہے اگر کسی اور بہادر انسان پر گذرتا تو شاید وہ دہل کر مر جاتا یا سہم کر عرصہ تک اختلاجِ قلب وغیرہ میں مبتلا رہتا لیکن ہم نے اس آزمائشی اور امتحانی موقع پہ اپنے ہوش و حواس کو اس حد تک قائم رکھا کہ نہ تو خوف کی وجہ سے دم نکلا اور نہ اختلاج

قلب کی شکایت مستقل طور پہ پیدا ہوئی البتہ گھگی ضرور بندھ گئی تھی۔ خیر یہ کوئی ایسی بزدلی کی بات نہیں۔

قصہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں مسلّح ڈاکوؤں کی کثرت نے ایک تو یونہی سب کو ڈرا رکھا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ کسی اللہ کے بندے نے ایک خط بھی ہم کو بھیجد یا کہ اگر جان کی خیریت چاہتے ہو تو ایک ہزار روپیہ ہماری نذر کرو، ورنہ مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس خط کو دیکھ کر پہلے تو تھوڑی دیر کے لئے ہم کو بھی محسوس ہوتا رہا کہ واقعی قلب کی حرکت بند ہونے والی ہے لیکن پھر ہم نے اس بزدلی پر دل ہی دل میں خود ہی اظہارِ تنفر کیا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ خط لے کر بیگم کے پاس پہنچے تاکہ ان کو بھی یہ الٹی میٹم دکھا کر خطرہ کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن بیگم ٹھہریں عورت، ان کا خط دیکھتے ہی گویا دم نکل گیا، ایک دم سے زرد پڑ گئیں اور ڈرتے ڈرتے بھرّائی ہوئی آوازیں کہنے لگیں۔ پھر؟"

ہم نے بہادرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "پھر کیا دیکھا جائیگا"

بیگم نے ہکّا بکّا ہو کر کہا "دیکھا کیا جائیگا؟ مجھ کو اور بچوں کو لیکر آج ہی زرد کوٹھی چلئے میں اب یہاں ایک منٹ نہ ٹھہروں گی"

ہم نے بیگم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں آج ہی تمام زیور اور روپیہ بنک میں رکھوائے دیتا ہوں اور ایک پہاڑی بندوقچی پہرہ دینے پر نوکر رکھے لیتا ہوں "

بیگم نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا :۔

" اس سے کیا ہوگا اگر ڈاکوؤں کو روپیہ نہ ملا تو وہ جان لیں گے۔ بنک میں روپیہ رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

ہم نے کہا " مگر بنک میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اور بچوں کو بھی وہیں رکھوا دوں، ہم سب کی حفاظت خدا کریگا "

بیگم ہیں ذرا مذہبی قسم کی آدمی، خدا کا نام سُن کر دل سے نہ سہی، مگر اخلاقاً اس انداز سے چپ ہو گئیں کہ گویا اطمینان تو نہیں ہوا ہے۔ مگر مجبوری کا نام شکر ہے۔ بہر حال ہم واقعی صرف یہی کر سکتے تھے کہ روپیہ اور زیور بنک میں رکھوا لیں اور پہرہ دار نوکر رکھ لیں، اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی کیا کہ وہ دہشت انگیز خط جو ہم کو موصول ہوا تھا پولیس میں بھجوا دیا اور اس کے بعد اپنے کو مع بال بچوں کے خدا کو سونپ کر بیٹھ رہے۔

جس روز کا یہ واقعہ ہے اُس دن چراغ میں بتّی پڑتے ہی ہمارا تمام گھر

مقفل کر دیا گیا۔ پہرہ دار خاص ہمارے کمرے کے دروازے پر تعینات کر دیا گیا اور کمرے کے اندر بھی یہ انتظام تھا کہ خود ہماری چارپائی پر توشک کے نیچے بندوق بھی اور تکیہ کے نیچے کارتوس۔ بیگم نے اپنے دونوں بچوں کو ان کے بستروں کے بجائے خود اپنے پاس لٹایا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ تمام رات کوئی نہ سوئے گا حالانکہ بغیر طے کئے بھی نیند کا آنا ذرا مشکل ہی تھا۔ بہرحال شام ہی سے ہم اس طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھ گئے کہ گویا کسی کی آمد آمد ہے۔

رات کا ابتدائی حصہ بخیریت تمام گذر گیا اور ۱۲ بجے رات تک سڑکوں پر آدمیوں کی اور سواریوں کی آمد و رفت سے چہل پہل رہی لیکن اس کے بعد سناٹا ہونے لگا یہاں تک کہ ایک ہُو کا عالم ہو گیا۔ رات کی بھیانک تاریکی اور وحشت ناک سناٹا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب کو نگل جائیگا اور بغیر ڈکار لئے ہضم کر جائیگا۔ اس وقت گویا ہم تاریک رات کے بھیانک سیاہ دیوکی آغوش میں تھے کہ جب وہ چاہے ہم کو اٹھا کر منہ میں رکھ لے۔ اس خوفناک سکوت کو اس طرح توڑا جا سکتا تھا کہ ہم بیگم سے باتیں کرتے اور بیگم ہم سے لیکن دونوں اس قیمتی وقت کو فضول بک بک میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنی اپنی جگہ پر یہی سوچ رہے تھے کہ جب ڈاکو آئیں گے تو ہم ان کا خیر مقدم کس طرح

کریں گے یا جب وہ ہم کو اپنے تیور دکھائیں گے تو ہم کس طرح ہاتھ اٹھا کر اعلانِ شکست کریں گے اور جب وہ ہم سے روپیہ طلب کریں گے تو ہم کس طرح اپنی ناداری اور مفلسی کا ان کو یقین دلائیں گے پھر اگر خدانخواستہ ان ظالموں نے ہم کو قتل وغیرہ کیا تو کیا ہوگا؟"

پہرہ دار نے نہایت ڈراؤنی آواز سے کہا: "ہا ــــــ ہو"

ہم تو خیر چھ سات انچ اُچھلے ہوں گے کہ بیگم غڑاپ سے لحاف کے اندر گھس گئیں اور سانس روک کر رہ گئیں اس حماقت کا احساس ۵ منٹ بعد ہم کو اور سات منٹ بعد اُن کو ہوا مگر اس کے باوجود نہ ہنسی آئی اور نہ دونوں میں سے کسی نے اس پر کوئی تبصرہ کیا بلکہ پھر اس طرح بیٹھ گئے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یعنی سکوت کا یہ عالم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن نہایت صاف سن رہے تھے اور ذرا ذرا سے کھٹکے پر یہ آواز اور بھی تیزی کے ساتھ ڈبل مارچ کرتی ہوئی سنائی دیتی تھی، ہم نے اس بزدلانہ خاموشی پر خود ہی جو غور کیا تو کچھ شرم سی آنے لگی۔ لہٰذا یہ طے کیا کہ کوئی کتاب پڑھ کر یہ وقت ٹالا جائے مگر سوال

یہ تھا کہ کتاب تھی میز پر اور چارپائی تھوڑے فاصلہ پر، لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نازک موقع پر ہم چارپائی سے اُٹھتے اور میز تک جاکر وہاں سے کتاب لاتے اور فرض کر لیجئے کہ ہم اس طرح اپنے کو خطرے میں ڈال بھی دیتے لیکن اگر اسی وقت کوئی آجاتا تو بڑی مشکل ہوتی۔ لہٰذا یہ ارادہ ملتوی کرنا ہی پڑا اور یہی مناسب معلوم ہوا کہ بیگم سے باتیں کریں چنانچہ اس اسکیم کے نشیب و فراز پر خاموشی کے ساتھ خوب اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر چپکے چپکے باتیں کی جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں لہٰذا تھوڑی دیر تک ارادہ کرنے کے بعد ہم نے کہا :-

"بیگم"!

بیگم نے زیر لب کہا "ہوں"!

ہم نے کہا "جاگ رہی ہو نا"؟

بیگم نے پھر اسی طرح بغیر منہ کھولے ہوئے کہا "ہوں"!

ہم نے چپکے سے کہا "ڈرنا نہیں ہم جاگ رہے ہیں"!

بیگم نے اس کا جواب دینا کچھ ضروری نہیں سمجھا اور ہم بھی سوچنے لگے کہ اب کیا کہیں کیونکہ ہم کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ہی نہ رہی اس لئے کہ چار پانچ ملکہ

اس سے بھی زیادہ کتوں نے آواز ملاکر خوفناک طریقہ پر بھونکنا شروع کیا اور ان کے بھونکنے سے قدرتی طور پر ہم کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ غالباً یہی فیصلہ بیگم صاحبہ نے بھی کیا، اس لئے کہ چپکے سے انہوں نے پوچھا:-

"کُتے کیوں بھونک رہے ہیں؟"

ہم نے کہا:"معلوم نہیں۔"

بیگم نے کانا پھوسی کے انداز سے پوچھا "چوکیدار سو گیا؟"

ہم نے رازدارانہ طریقہ پر جواب دیا "معلوم نہیں۔"

بیگم نے کہا:"اس کو آواز دیجئے۔"

ہم نے کہا:"ابھی چُپ رہو۔ کتے ذرا چُپ ہو جائیں۔"

مگر سوال یہ تھا کہ کُتے واقعی کیوں بھونک رہے ہیں یقیناً انہوں نے کسی اجنبی آدمی کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا ہے اور کیا تعجب ہے، کہ وہ آدمی ڈاکو ہو اب خطرہ نزدیک تھا اور خطرہ کے نزدیک ہونے کی یہ علامت بھی پائی جاتی تھی کہ ہمارے دل کی حرکت سول مرڈس کپ کی ریس بن گئی تھی اور ہاتھ پیر ذرا کانپ رہے تھے۔ کتے بدستور بھونک رہے تھے بلکہ بھونکتے ہوئے عین ہمارے مکان کے

سامنے آ گئے تھے کہ ناگاہ

"آہ —— ہائے —— ہاہا"

اب کے ہم بھی سجدے میں گر پڑے اور معلوم نہیں "ہائے" کہہ کر بیگم کا کیا حشر ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد آواز آئی :-

"جاگتے رہو"

ہم بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور بیگم بھی لیکن کتّے بدستور قیامت برپا کئے ہوئے تھے بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں پھر کہا :-

"یہ کتّے کیوں بھونکے جاتے ہیں ؟"

ہم خود ہی اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے - آخر ہم نے ہمّت کر کے چوکیدار کو چپکے سے پکارا اور پوچھا کہ یہ کتّے کیوں بھونک رہے ہیں ؟"

اس نالائق نے لاپروائی سے جواب دیا" ان کا اور کام ہی کیا ہے ؟"

ہم نے اس مہمل جواب سے جل کر مگر خوشامدانہ انداز سے کہا :-

"پھر بھی آخر بات کیا ہے ؟"

اس پہاڑی گدھے نے پھر وہی مہمل جواب دیا کہ "حضور اگر وہ بھونکیں نہ تو کتّا اُن کو کون کہے ؟"

ہم جل بھن کر چپ ہو رہے۔ اس لئے کہ زیادہ بات چیت کرنا بھی موقع اور محل کے اعتبار سے مناسب نہ تھا۔ لیکن کتوں کا بھونکنا یقیناً بلا وجہ نہیں ہو سکتا اور پھر عین ہمارے دروازے پر کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی بہر حال ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ چپکے سے اٹھا کر بستر پر اس جگہ رکھ لیا جہاں بستر کے نیچے بندوق رکھی ہوئی تھی مگر اب ہم کو معلوم ہوا کہ بندوق اس قسم کے موقعوں کے لئے بالکل بیکار چیز ہے اس لئے کہ اس کمبخت کیلئے یہ ضروری بات ہے کہ اس کو چلایا بھی جائے تو چلے اور یہاں سوال یہ درپیش تھا کہ آخر چلائی کس طرح جائے گی۔ اور کس کا ڈر سے چلائی جائے گی ہماری نشانہ بازی مسلم، ہماری بندوق بازی کی مہارت تسلیم لیکن جناب ڈاکو کوئی ہرن یا نیل گائے، کوا، یا تیتر تو تھے نہیں کہ خاموشی سے گولی کا ڈھیر ہو جاتے یہاں تو برابر کا مقابلہ تھا اگر ایک گولی تم چلاؤ تو دس گولیاں ادھر سے چلائی جائیں گی پھر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بندوق بھی بھری ہوئی نہیں تھی بلکہ بغیر بھری ہوئی چارپائی کے ایک طرف رکھی ہوئی تھی اور کارتوس تکیہ کے نیچے تھے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پہلے بندوق بستر کے نیچے سے نکالی جائے پھر اس میں تکیہ کے نیچے سے کارتوس نکال کر بھرے جائیں اس کے بعد اگر گھوڑا انگلی سے دبے تو بندوق

چھوٹ سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ استغفر اللہ یہ بھی کوئی تفریح بھی شکار تھا کہ اس قدر اہتمام کے بعد بندوق چلائی جاتی، مجبوراً ہم نے بندوق پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور دراصل یہ ہماری ایمانی کمزوری ہی تھی کہ خدا کو بھول کر بندوق سے کوئی توقع رکھتے۔ چنانچہ بندوق سے مایوس ہو جانے کے بعد ہم نے اپنے ذہن میں سوائے خدا کے اور کسی کو نہ رکھا اور واقعی اس خیال کے آتے ہی اس قدر تقویت پیدا ہو گئی کہ ہم نے آزادی سے منہ کھول کر سانس لینی شروع کر دی اور اس وقت پہلی مرتبہ داڑھ میں دبے ہوئے پان کو بھی چبایا بلکہ ایک آدھ ڈگری بیگم کو بھی گردن گھما کر دیکھا کہ کس حال میں ہیں وہ اللہ کی بندی دروازے پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھی کہ گویا اب دروازہ کھلا اور اب کوئی آیا خیر یہ تمام صورتیں تو جس طرح ہو سکتا تھا برداشت کی جا رہی تھیں مگر اس مصیبت بالائے مصیبت کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسی نازک موقعہ پر پیشاب نے بھی ستایا یہ دراصل ہماری ہی حماقت کا نتیجہ تھا کہ مغرب کے بعد ہی پیشاب کر کے چارپائی پر آ گئے تھے ورنہ اگر ہم نے اول حصۂ شب کے سناٹے میں ایک مرتبہ اور اس طرف سے فراغت کر لی ہوتی تو اس وقت اس مصیبت کا سامنا نہ ہوتا چارپائی سے اٹھ کر غسل خانہ تک۔ یا کم از کم نابدان تک جانا اور وہاں اس بھیانک

رات کے سناٹے میں بیٹھ کر تنہا پیشاب کرنا ظاہر ہے کہ ایک ناممکن اور ناقابلِ عمل سی بات تھی۔ یہی ایک صورت تھی کہ پیشاب کو روکا جائے لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ وہ تمام تدابیر عمل میں لائی جا چکی تھیں جو اس قسم کے مواقع پر پیشاب کو روکنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اتفاقاً عین اسی موقع پہ ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہم نے غسل خانہ جانے کا ارادہ بھی کیا تو بیگم خود ہی ہم کو نہ جانے دینگی اور اگر ہم گئے بھی تو وہ خود ہمارے ساتھ چلیں گی۔ بہر حال دونوں صورتوں میں ہمارا مقصد حل ہوا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم نے بیگم سے کہا۔

"سنتی ہو!"

بیگم نے چپکے سے کہا "کیا ہے؟"

ہم نے کہا "پیشاب"

بیگم نے اس مسئلہ کو کوئی معمولی سی بات سمجھ کر کہا "اونہہ ہوگا بھی!"

ہم نے کہا "بڑے زور سے معلوم ہو رہا ہے بس اب نکلنے ہی والا ہے"

بولیں "تو جاؤ پھر"

ہم نے حیرت سے کہا "اور تم ڈرو گی تو نہیں؟"

بیگم نے کہا "اگر اس وقت یہاں کر لو تو کیا ہرج ہے؟"

ہم نے اعلانًا کہا " یہاں ؟ یعنی کمرے کے اندر ؟ اجی نہیں بُرا معلوم ہوتا ہے ! "

بیگم نے کہا " ہوگا بھی ، صبح کمرہ دُھل جائے گا "

ہم نے پھر کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کہ یہ بھی ممکن تھا کہ بیگم ہمت کر کے ہم کو باہر جانے کی اجازت دے دیتیں اور اس کا بھی امکان تھا کہ ناگہانی طور پر یہ ضرورت ہی باقی نہ رہتی ، لہٰذا ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے نا شیدن کا مصدر گردانا شروع کیا تاکہ کیا عرض کیا جائے کہ عین اسی موقع پر

" آ ——— خاموش ——— ہوا ؤ ——— خبردار "

کی فلک شگاف بھیانک آواز نے ہم کو مجبور کر دیا کہ پیشاب کا سلسلہ غیر ارادی طور پر بانی آئندہ کرتے ہوئے جوں کے توں ڈھلک کر لحاف کے اندر گھس بیٹھے اور جب کچھ دیر کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ پہرہ دار نے اپنا فرض انجام دیا تھا تو ہم نے بھی لیٹے لیٹے ہی بیٹھے ازار بند کس لیا اور پیشاب کی دوسری قسط بھی ادا کرنے کا خیال نہ رہا ۔ اس وقت تقریباً ڈھائی بجے تھے اور ڈاکوؤں کے انتظار کے باوجود نیند کا بھی غلبہ تھا بلکہ بیگم تو شاید بیٹھے ہی بیٹھے اونگھ بھی رہی تھیں

مگر ہم سونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اگر اس وقت سونے کا ارادہ کرتے تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید پھر حشر سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی، مانا کہ پہرہ دار جاگ رہا تھا وہ اسی لئے نوکر رکھا گیا تھا کہ ہم اطمینان سے سوئیں اور وہ جاگتا رہے لیکن انسان ہی تو تھا اگر وہ بھی سو جاتا اور ڈاکو اتفاق سے آجاتے تو ظاہر ہے سیدھے ہمارے سینہ پر چڑھ جاتے۔ اس وقت کیا ہوتا؟ اس خیال سے ہم جاگتے رہے بلکہ زبردستی جاگتے رہے، جمائیاں آتی رہیں، انگڑائیاں لیتے رہے لیکن سو جانا خطرناک تھا البتہ چونکہ آنکھ بند کرنے میں ذرا لطف آتا تھا لہٰذا کبھی کبھی ایک ایک سیکنڈ پھر چار چار سیکنڈ۔

"پھر ——— پھر ——— خر خر خر"

غالباً ابھی آنکھ لگی تھی کہ ڈاکو موقع پا کر چڑھ بیٹھا اور ہم اُچھل کر جاگ پڑے، ڈاکو ہم پر لدا ہوا تھا اور ہم کلمہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے تھے، سانس تک رک لی تھی۔ آنکھیں بھینچ کر بند کر لی تھیں اور زندگی کی آس، آخری کشمکش پر موت کو ترجیح دے رہے تھے کہ یکایک ڈاکو نے کہا "او، او، او، او، اوؤ" اور ہم نے بھی غیر ارادی طور پر اس کی آواز سے آواز ملا کر کہنا شروع کیا "او، او، او، او" ہم لحاف کے اندر سے اور ڈاکو لحاف کے اُوپر سے اسی متواتر

اور مسلسل اور اور میں مصروف تھے بلکہ دونوں بچے بھی غالباً جاگ کر اس آواز میں شریک ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ نہایت مہین اور باریک آواز یں بھی اس راگ میں شامل تھیں، البتہ پہرہ دار نہایت کرخت آواز میں "کیا ہے؟ کیا ہے؟" شور بلند کئے ہوئے تھا آخر کار وہ دروازہ کھول کر کمرہ میں گھس آیا، پہلے زبانی "کیا ہوا، کیا ہوا؟" کہتا رہا، حالانکہ اندھا دیکھ رہا تھا کہ ڈاکو ہم پر سوار ہے۔ آخر کار ڈاکو کو ہم پر سے ہٹا کر کہا:۔

"بیگم صاحبہ چپ تو ہوئیے آخر ہوا کیا؟"

اب ذرا ہماری بھی گھگی پنچم سے مدھم کے سروں پہ آئی اور رفتہ رفتہ خاموش ہوئے، لحاف ہٹا کر دیکھا تو بیگم صاحبہ پہرہ دار کے پاس بدحواس کھڑی تھیں اور پہرہ دار دونوں بچوں کو اُٹھائے ہوئے تھا۔ پہرہ دار نے ہم سے پوچھا۔

حضور آخر ہوا کیا؟

ہم نے ہانپتے ہوئے کہا "ڈاکو مجھ پہ چڑھ بیٹھا تھا!"

بیگم نے کہا "نہیں ڈاکو نہیں، میں آپ کے پاس آئی تھی۔ ڈاکو تو باورچیخانہ میں جاکر بدن سمیٹ رہا تھا!"

پہرہ دار نے فوراً لالٹین اُٹھا کر باورچی خانہ میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو

نے سوائے اس کے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گرا کر دودھ پھینک دیا
اور پھر اس کو چاٹ بھی گیا۔

پہرہ دار نے کہا "واہ، واہ"

بچے ہنس دیئے

بیگم نے کہا "توبہ ہے اللہ"

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ اب کے یہ حرامزادی بلی آئی تو گولی مار دونگا"

اس کے بعد مرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سو رہے تھے۔

شاہین بچے

میرے یہاں خدا کے فضل سے تین شاہین بچے ہیں جو آپ کی دعا سے خاکبازی کی تعلیم حاصل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو میں خدا وندانِ مکتب کا ممنونِ احسان ہوں کہ وہ ان شاہین بچوں کو بھی یقین دلائے ہوئے ہیں۔ کہ وہ نمولے ہیں۔ جس طرح اللہ آمین سے ان کو پروان چڑھا کر مکتب جانے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح مکتب بھی ان کے لیے بسم اللہ کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جہاں ان کو خود اڑنا نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ پروں کی گیند اچھالنا سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تینوں شاہین بچے جب اسکول سے گھر آتے ہیں۔ تو ایک جال تان کر دن

تک بیڈمینٹن کھیلا کرتے ہیں۔ اور وہ پروں والی گیند۔ ان کے درمیان اچھلا کرتی ہے۔ جب تمام شٹل کاک خراب ہو جاتے ہیں۔ تو ان شاہین بچوں کی ماں مجھ سے کہتی ہے کہ :-

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

اور میں تو اسی دن ایک درجن شٹل کاک بازار جا کر خرید لاتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شاہین بچے نہایت محفوظ قسم کا کھیل کھیلتے ہیں جس میں نہ کوئی جان جوکھم کا معاملہ ہے۔ نہ منہ ٹوٹنے اور سر پھٹنے کا کوئی اندیشہ۔ اگر بارش ہو گی۔ اور پروں والی گیند کی پرواز میں کوتاہی واقع ہو گی۔ تو یہ شاہین بچے ایک بڑی سی میز پر جال تان کر چھوٹی چھوٹی ہتھائیوں سے سلولائڈ کی ہلکی پھلکی گیند سے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں۔ جس کو وہ پنگ پانگ کہتے ہیں۔ یہ کھیل بھی کچھ خطرناک نہیں ہے۔ کہ چوٹ چپیٹ کا اندیشہ ہو۔ یا مثلاً کیرم ہے۔ یہ بھی محفوظ قسم کا کھیل ہے۔ کہ انگلی ذرا بچا کر اسٹرائکر چلایا جائے۔ تو کسی قسم کے گزند کا امکان نہیں۔ بڑا شاہین بچہ چونکہ کالج میں پڑھتا ہے۔ لہٰذا وہ کبھی کبھی برڈ کھیلنے بھی چلا جاتا ہے۔ یا اپنے احباب کو بلا کر جو اتفاق سے سب کے سب شاہین بچے ہیں۔ تاش وغیرہ کھیل لیتا ہے۔ اس میں نقصان مایہ تو ہے۔ بلکہ شماتت

ہمسایہ بھی ہے۔ مگر یہی کیا کم ہے۔ کہ زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ لہٰذا میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ وہ برج اور پوکر وغیرہ کھیل کر کچھ ہار جاتا ہے مگر ہاکی اور کرکٹ قسم کے خطرناک کھیل تو نہیں کھیلتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ قمار بازی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہی کیا کم ہے۔ کہ کوئی جان کی بازی نہ لگائے۔ جب تک میں کما رہا ہوں ان کی قمار بازی بھی ایک قسم کی بالشتیں بابا بازی ہے۔ اس کے بعد خود ہی سنبھل جائیں گے مطلب تو یہ ہے۔ کہ کسی طرح بھی تو بچیں۔

میں اپنے اوپر زمانے کی تمام سختیاں ان ہی شاہین بچوں کے لئے جھیلتا ہوں کہ ان کا بال بیکا نہ ہو۔ جاڑے کی ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں لحاف ایسی نعمت کو چھوڑ کر میز پر بیٹھا دماغ کو ان ہی کے آرام کے لئے نچوڑا کرتا ہوں۔ کہ ان کے لئے سویٹر سے لے کر بستر تک ہر چیز اعلیٰ درجہ کی میسر آ سکے۔ اور جب مئی جون کی آگ برسانے والی گرمی انسان کو بھون کر رکھ دیتی ہے۔ میں ان شاہین بچوں کے لئے خسخانہ اور برفاب کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنی تکلیف کا خیال کئے بغیر ان سے یہی کہتا ہوں۔ کہ ۔ ۔

تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور ان کو پہاڑ پر بھیج کر خود اسی جہنم میں بدستور محنت کرتا رہتا ہوں۔ کہ ان کے پہاڑ کے اخراجات برابر بھیجتا رہوں اگر وہ کہتے بھی ہیں "آپ نہیں چلیں گے پہاڑ پر" تو کہہ دیتا ہوں کہ۔ میں تم کو محض اس لئے شاہین بچہ کہتا ہوں کہ تم مجھ کو کرگس ہی سمجھتے رہو!

میرے یہ شاہین بچے تکلیف اُٹھانے کے عادی نہیں ہیں۔ فاقہ تو خیر خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ یہ شاہین بچے تو موٹا جھوٹا بھی نہیں کھا سکتے۔ کھانا تو درکنار اگر چائے کا وقت بھی ٹل جائے۔ تو ان کے دشمنوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی چائے نہ ملے۔ تو درد سر اور اگر درد سر کے بعد بھی چائے میسر نہ آئے تو حرارت۔ حرارت کے بعد بخار اور پھر بخار تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ ہزاروں طرح کا ہوتا ہے۔ لہٰذا طے یہ ہے کہ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر ان کو وقت پر چائے ضرور ملنا چاہیئے۔ پھر چائے بھی نگوڑی نالٹی قسم کی نہیں خالی چائے تو کلیجے پر لگتی ہے۔ تیر کی طرح کچھ نہ کچھ تو چائے کے ساتھ کھانا ہی چاہیئے۔ اور اس کچھ نہ کچھ کے ذیل میں کیک۔ پیسٹری، بسکٹ، مختلف قسم کے پھل سب ہی کچھ آتے ہیں۔ رہ گیا کھانا وہ اگر ان شاہین بچوں کو اچھا نہ ملے گا۔ تو یہ نازو نعم میں پلے ہوئے اپنی صحت کیونکر برقرار

رکھ سکیں گے۔ صحت تو خیر روٹی اور سالن سے بھی برقرار رہتی ہے۔ مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ یہ غریبوں کا کھانا ہے۔ اور امیروں کے دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان شاہین بچوں کو ضعفِ قلب سے بچانے کے لئے کھانے کا بھی معقول ہی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ان کو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کا احساس نہ پیدا ہو۔ اور باپ کے گھر کو وہ یتیم خانہ سمجھ کر دل شکستہ نہ ہو جائیں۔

یہ قاعدے کی بات ہے۔ کہ اچھا کھانے والے اچھا پہننا بھی چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے۔ کہ وہ اپنے لباس میں ہر طرح کا تکلف برتتے ہیں۔ مگر اولاد کو کچھ اس طرح پہناتے اڑھاتے ہیں کہ وہ کچھ لے پالک یا سوتیلی سی اولاد نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بچے ابتدا ہی سے احساسِ کمتری کا شکار ہو کر گرگس زادے تو خیر بن جاتے ہیں۔ مگر شاہین بچے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں اپنے شاہین بچوں کو اپنی اوقات سے زیادہ شاندار لباس بھی مہیا کرتا ہوں۔ اور وہ بھی ایسے تمیزدار ہیں۔ کہ کیا مجال کہ نیلے سوٹ پر براؤن جوتا یا کریم رنگ کے پتلون پر سیاہ بوٹ تو پہن لیں۔ میری آنکھوں میں خاک ایسے جامہ زیب بچے آپ کو مشکل ہی نظر آئیں گے۔ میری آنکھوں میں خاک میں نے اس لئے عرض کیا۔

کہ ماں باپ کی نظر سب سے زیادہ اولاد کو لگتی ہے۔ پھر یہ کہ میرے شاہین بچے اس قدر نفاست پسند ہیں۔ کہ اگر آپ ان میں سے کسی کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ کنگھا تو میز پہ کیا معنی وہ جیب میں بھی رکھتے ہیں۔ آئینے اور کنگھے کے علاوہ بے شمار شیشیاں ڈبے اور ڈبیاں آپ کو ان کی ڈریسنگ ٹیبل پہ سجی ہوئی نظر آئیں گی۔ رات کو لگانے کی کریم الگ ہے۔ صبح کو لگانے کی اسنو الگ ناخن تیز کرنے کے اوزار۔ بالوں میں چھلے بنانے کے کل پرزے۔ بھنوؤں کا تناسب قائم رکھنے کے لئے بال کی کھال نکالنے والی قینچیاں۔ لبوں پہ لگانے کے لئے خاص قسم کے موم روغن مختصر یہ کہ ایک دکان سی سجی ہوئی نظر آئے گی۔ اور یہ تمام چیزیں محض اس لئے مہیا کرنا پڑتی ہیں۔ کہ شجرہ تو ان کے گلے میں لٹکایا نہیں جا سکتا۔ صورت ہی سے شرافت برسائی جا سکتی ہے۔ کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں کہ ہاں یہ ہیں۔ نجیب الطرفین شاہین بچے۔

اس طرح تو صاحب ان شاہین بچوں کو پروان چڑھایا گیا ہے اور مرزا صاحب سے جو پوچھا کہ بڑے بچے کو آخر کس کام سے لگایا جائے کالج سے نکلنے والا ہے۔ تو عقلمندی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔ کہ

قبلہ میری تو یہ رائے ہے کہ ایر فورس میں بھیجدیجئے

ایر فورس کا نام سُن کر ہوش اُڑ گئے۔ یعنی ہوائی جہاز کی نوکری چہ خوش۔ عرض کیا۔ مرزا صاحب میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی رائے طلب کی تھی۔ کہ آپ ماشاء اللہ خود صاحبِ اولاد ہیں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دینگے۔ مگر آپنے تو عجیب بات فرمائی ہے"۔

مرزا صاحب نے اسی استغنا سے فرمایا۔ میں نے تو اپنے نزدیک بہترین مشورہ دیا ہے۔ صاحبزادے کی ماشاء اللہ صحت بھی اچھی ہے۔ چشم بد دُور ہاتھ پیر کے بھی اچھے ہیں۔ ان کے لئے ایر فورس میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں۔ اور اگر سچ پوچھیے تو ہمارے ایر فورس میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

عرض کیا۔ ترقی گئی بھاڑ میں مرزا صاحب ذرا غور تو فرمائیے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھلا کیونکر ایر فورس میں جھونک سکتا ہوں کہ جاؤ بیٹا اپنی جان سے دُور اُڑ جاؤ۔ ہے ہے تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ طرح طرح کے ہول آنے لگتے ہیں۔ یہ آپنے کیا مشورہ دیا ہے"۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کس قدر فرسودہ تخیل ہے۔ آپ کا

بھی۔ اے جناب اب وہ زمانہ گیا۔ جب ان لاڈلوں کو روئی کے گالوں میں پٹاری کے انگور کی طرح سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ اب آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ذمہ دار شہری ہیں۔

گھبرا کر عرض کیا۔ دیکھو بھئی مرزا۔ اولاد کے معاملہ میں تو یہ سیاسی باتیں مجھ سے کرو نہیں۔ مجھے ہوتی ہے۔ اُلجھن۔ میں سیاست کا بس اتنا ہی قائل ہوں کہ جتنا چاہو مجھ سے چندہ لے لو۔ کوئی مر جائے کالی شیروانی پہنا دو۔ مجھ کو کوئی سیاسی جشن ہو گھر پر چراغاں کرنے کو میں موجود ہوں۔ مگر چندے میں اولاد نہیں دے سکتا۔ یہ آپ نے کیا منہ بھر کر کہہ دیا۔ کہ ایوننگ کورس میں بھیج دوں۔

مرزا صاحب پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ جُوتوں سمیت آنکھوں میں گھُس کر بولے:۔ بندہ نواز اب یہ خودنگری اور خودشناسی کا دَور ہے۔ اب قوم کا ہر فرد سپاہی ہے۔ ملّت کا ہر نوجوان ملّت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ اگر آپ اسی طرح ان شاہین بچّوں کو ممولا بنائے رکھیں گے۔ اور شہباز بننے سے روکیں گے۔ تو آخر ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔

اُلجھ کر عرض کیا۔ خیر میں آپ سے بحث تو کرنا نہیں چاہتا میں تو یہ پوچھ رہا

تھا۔ کہ ان کے لئے وکالت اچھی رہے گی۔ یا ڈاکٹری۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ ڈاکٹری بھی اچھی ہے۔ اس وقت ہم کو ڈاکٹروں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنا ان بزرگوں کا فرض ہے۔ جو اپنے بچوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانے کی استطاعت رکھتے ہیں"۔

عرض کیا۔ ڈاکٹری کے فوائد تو میں خود جانتا ہوں۔ نہایت شریف پیشہ ہے۔ اور اگر چل نکلی ڈاکٹری تو دولت قدم بھی چومے گی۔ مگر قباحت یہ ہے کہ صاحبزادے واقع ہوئے ہیں۔ نہایت کمزور دل کے ایک مرتبہ مرغ ذبح ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اب سے دور ایک ہفتہ تک بخار آتا رہا۔ سوتے میں اچھل اچھل پڑتا تھا۔ ڈاکٹری میں چیر پھاڑ کیسے کریں گے۔ اور یہی سنا ہے۔ کہ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے"

مرزا صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں یہ تو ہے۔ مگر اس میں مضائقہ کیا ہے۔

عرض کیا۔ جو مضائقہ ہے۔ اس کا افسوس یہ ہے۔ کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہرحال ڈاکٹری سے تو باز آیا میں رہ گئی وکالت ویسے تو اس پیشہ میں کوئی خرابی نہیں۔ مگر ایک بات سے ذرا ڈر لگتا ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ وکالت نہ چلی اور صاحبزادے بن گئے کچھ لیڈر ویڈر۔ تو میں کیا کرونگا"۔

مرزا صاحب عقل کے ذرا اوجھی ہی سے لوگ ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ "تو اور کیا چاہیئے۔ آپ تو آگے صاحبزادے لیڈر بن جائیں۔ اور ان کو عوام اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو اس سے زیادہ آپ کے لئے باعثِ فخر اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔

سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔ "میاں بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ لیڈر کوئی یوں ہی نہیں بن جاتا۔ اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے مردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سنے ہیں۔ صرف پھول ہی نچھاور نہیں کئے جاتے۔ جوتے بھی اچھالے جاتے ہیں۔ خوش آمدید ہی نہیں کہا جاتا۔ واپس جاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ جلوس ہی نہیں نکلتا کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ خیر یہ سب کچھ بھی سہی مگر لیڈر بننے کے لئے پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں کبھی کبھی اور شیطان کے کان بہرے جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے۔ بس میں ان ہی باتوں سے ذرا ڈرتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے وکیلوں بیرسٹروں ہی کو زیادہ تر لیڈر بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا وکالت سے کچھ دِل کھٹا سا ہو گیا ہے"

مرزا صاحب نے گویا تمسخر سے فرمایا۔ "اس قسم کے اندیشے تو کم و بیش ہر

مشغلہ میں موجود ہیں - اور یہ نشیب و فراز تو عملی زندگی میں ہر ایک کے لئے موجود ہیں - زیادہ محتاط طریقہ تو یہ تھا - کہ اس زمانہ میں ان صاحبزادوں کو پیدا ہی نہ کیا جاتا ۔

عرض کیا خیر اب تو پیدا ہو ہی گئے ہیں - لہٰذا کچھ کرنا ہی پڑیگا - میں کہتا ہوں کسی مقابلہ کے امتحان میں کیوں نہ بٹھادوں -

مرزا صاحب نے کہا - بڑا اچھا خیال ہے - مگر ان امتحانوں میں بھی اس قسم کی خطرناک وادیوں سے گزرنا ہی پڑے گا - مثلاً پولیس کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتے ہیں -

کانوں پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا - اجی تو یہ کہیے مرزا صاحب ہتھیلی پہ جان لئے پھرتے ہیں - یہ بیچارے پولیس والے ایسی بھی سر فروشی کیا کہ انسان واقعی سر کاٹ کر بیچنا شروع کر دے - ایک سے ایک خونخوار بدمعاش سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے - پھر یہ کہ ایسی سخت ڈیوٹی کہ نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات - صاحب آدھی آدھی رات تک تو یہ پولیس والے گشت لگاتے پھرتے ہیں - بلوہ ہو جائے - تو گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر جاؤ - ان صاحبزادے نے تو آج تک شب برات کی آتش بازی بھی اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑائی - یہ

پستول کیونکر چلائیں گے۔ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں۔ جن کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کو میں نہایت غلط سمجھتا ہوں۔ یا گھوڑے کی جگہ پر وہ جو موٹر سائیکل آجکل نکلی ہے۔ وہ اور بھی خطرناک۔

مرزا صاحب نے پھر چٹکیوں پر اڑایا۔ اگر پولیس آفیسر ڈولی میں بیٹھا کریں۔ اور وردی میں چوڑیاں بھی ہوں۔ تو غالباً کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔"

جل کر عرض کیا۔ برادرم آپ تو خیر مذاق فرما رہے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے۔ کہ اس بچہ کے لئے میں ایسی ملازمت کو موزوں سمجھوں جس میں بس بدمعاشوں ہی سے واسطہ پڑے خواہ وہ بدمعاش انسان ہوں یا بدمعاش گھوڑے۔ مجھ کو تو اس کے لئے ایسے مشغلہ کی ضرورت ہے۔ جس میں امن و امان کے ساتھ زیادہ نہیں تو بس اتنا پیسہ مل جائے۔ کہ جس طرح کی زندگی میں نے اس کو بسر کرائی ہے۔ وہ خود بھی بسر کر سکے۔

مرزا صاحب بولے :- بندہ پرور آپ نے تو بچوں کو مرزا پھویا بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ زمانہ آلگا ہے۔ کہ مردوں کو مرد بن کر رہنا پڑیگا۔ وہ گہوارے میں جھولنے کا زمانہ گیا۔ اب آپ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں۔ اور قوم کی یہ آزادی اسی وقت تک برقرار رہ سکتی ہے۔ جب تک قوم کے ہر فرد میں اس آزادی

کے تحفظ کا صرف جذبہ ہی نہیں۔ بلکہ بل بوتا بھی موجود ہے۔ ہر شخص ملّت کا جانباز سپاہی بن کر رہے گا۔ اب ملّت کے افراد موت سے ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے حقوق حاصل کریں گے۔ یہ عمل پیہم کا زمانہ ہے۔ یہ جد و جہد کا دور ہے۔ یہ ہم کو تلافی مافات کا موقع ملا ہے۔ اور اگر اس وقت بھی ہمارا یہی عالم رہا۔ جو آپ کا میں دیکھ رہا ہوں تو پھر خدا ہی حافظ ہے ہمارا۔

عرض کیا۔ بھائی جان آپ تو یہ باتیں کچھ کتابوں کی دنیا کی کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کتابوں میں تو خیر پڑھی جا سکتی ہیں۔ مگر ان پر عمل ذرا مشکل سے ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب بات کاٹ کر بولے۔ عمل کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی مثال موجود ہے۔ کہ میں نے اپنے دو بڑے بچوں کو نیوی میں بھیج دیا ہے۔ دو چھوٹے بچے ایر فورس کے لئے تیار کر رہا ہوں۔ آخر ان بچوں کو بھی میں کہیں سے اُٹھا تو نہیں لایا تھا۔ اولاد ہی تو ہیں۔ مگر میں اولاد کے ساتھ جو بہتر سے بہتر سلوک کر سکتا تھا۔ وہ یہی تھا جو میں نے کیا۔

عرض کیا:- یہ سلوک کیا۔ کہ ان کو جان بوجھ کر ایسے محکموں میں بھیج دیا کہ خدا ہی ان کا حافظ ہے۔ اصل میں یہ بڑی ہی غلطی تھی۔ کہ میں آپ سے

مشورہ کرنے بیٹھ گیا جس نے خود اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔ وہ دوسرے کی اولاد کے لئے دل میں کیا درد رکھ سکتا ہے۔"

مرزا صاحب نے پھر بنانے کی کوشش کی ۔ میری رائے میں تو آپ صاحبزادوں کو ایک ایک دودھ کی شیشی خرید کر ایک ایک کھلائی کے سپرد کر دیں۔ کہ ان کو لوریاں سناتی رہے اس لئے کہ ان ہی کو پاکستان کا امین بننا ہے۔ اور یہی اس آزادی کے محافظ ہوں گے۔

مرزا صاحب تو اس قسم کی جلی کٹی سنا کر تشریف لے گئے۔ عجیب پتھر دل پایا ہے اس شخص نے بھی مگر اب ہر ایک تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا غور تو کیجئے وہ بچے دھوپ میں کملا جائیں۔ جو ٹھنڈی ہوا میں چھینکیں لینے لگیں۔ ان کے لئے آپ تجویز فرماتے ہیں۔ ایر فورس۔ پولیس کی نوکری۔ فوج اور سپہ گری۔ سبحان اللہ دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے۔ تو وہ اچھل پڑتے ہیں۔ ننھا سا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا وہ پستول اور بندوق سے کیونکر کھیل سکیں گے۔ اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ اپنے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ ان کو آنکھ بند کر جھونک دیا جائے۔ کسی ایسے محکمہ میں بلکہ اگر وہ خود اس قسم کا ارادہ کریں بھی تو میں یہی کہونگا۔ کہ

اللہ آئیں سے ہم خوبیوں پا لیں
آفت میں سب جان کو ڈالیں

یہاں زندگی کے لالے پڑے ہیں جی۔ بچپن میں ہی بہت ہے۔ اگر یہی
روزگار رہ گئے ہیں۔ تو ان کے لیے بیکاری بھلی۔

لکھنؤ کانگریس سیشن

لکھنؤ میں اس مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اور خوب ہوا۔ خاصی چہل پہل تھی۔ خاصی رونق تھی۔ آر بیر نگر کے جنگل میں ایسا منگل منایا گیا کہ اس ویرانہ کو موتی نگر بنا کر جھپکا دیا گیا۔ نمائش بھی تھی اور مشاعرہ بھی۔ ڈرامہ بھی ہوا اور کوئی سمیلن بھی۔ لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس موقع پر ہم کو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اربابِ کانگریس ہیں گلستانِ اودھ کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب اس چمن کی بہاریں لوٹ لی گئیں اور خزاں نے اس کو اُجڑا ہوا دیار بنا دیا۔ کاش وہ شاہی زمانہ ہوتا جب یہاں کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب

شب برات ہوا کرتی تھی۔ اس عروس البلاد میں اگر اس وقت کانگریس سیشن ہوتا تو معلوم بھی ہوتا کہ ہاں صاحب لکھنؤ میں بھی کانگریس ہوئی تھی۔ مگر اب تو جس طرح احمد آباد یا بمبئی میں اجلاس ہوئے اسی طرح لکھنؤ میں بھی اس فرض سیاسی کو ادا کر دیا گیا۔ مگر اس وقت یعنی جب لکھنؤ لکھنؤ تھا۔ یہاں سیشن ہوتا اخبارات وہ رپورٹ پیش نہ کرتے جو آج پیش کی جا رہی ہے بلکہ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے عالم تصور کی سیر کرنا چاہیں تو اپنے کو لکھنؤ کے شاہی دور میں فرض کر لیجئے اور ملاحظہ فرمائیے اس شاہی دور کے کانگریس سیشن کی روداد۔

لکھنؤ کے موتی نگر کا صدر دروازہ جامہ دار کا بنا ہوا تھا اور اُوپر ایک گنگا جمنی چھتر لگا تھا۔ اس چھتر کے نیچے ہی روشن چوکی رکھی ہوئی تھی۔ جس کے سریلے زمزمے فضا میں ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس دروازہ پر مجلس استقبالیہ کے صدر اور چند اراکین مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود تھے اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ بڑھ بڑھ کر اور دیدہ و دل فرش راہ کر کر کے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب بہار نظر آتی تھی۔ سُرخی کٹی ہوئی۔ سڑکوں پر کیوڑہ اور گلاب کا چھڑکاؤ تھوڑی

تھوڑی دیر کے بعد ہو رہا تھا اور سڑکوں کے دو رویہ ریشمی جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی اور بیلے کے پھولوں کی لڑیاں عطر میں بسی ہوئی حسن افروز بھی بنی ہوئی تھیں اور شامہ نواز بھی۔ ان ہی سڑکوں پر جا بجا ساقی حقہ لئے ہوئے اور حقہ پر ہار لپیٹے ہوئے ٹہل رہے تھے جن کے خمیرے کی خوشبو اور بھی قیامت تھی۔ جو سڑک صدر دروازہ سے عام اجلاس کے پنڈال تک گئی تھی۔ اس کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی پان کی دوکان تھی تو کوئی پھپکیوں کی۔ کہیں گنڈیریاں برف میں دبی ہوئی پھولوں میں بسائی جا رہی تھیں۔ تو کہیں دکان پہ انواع و اقسام کے کنکوے اور ہر قسم کی ڈور بھی ہوئی تھی۔ کوئی جامدانی کی دکان تھی تو کسی دکان میں لکھنؤ کی مشہور و معروف زردوزی کے نمونے نظر آتے تھے مختصر یہ کہ دو فرلانگ تک یہ خاص سڑک اسی طرح بارونق بنائی گئی تھی۔ کہ گویا چوک کی تمام چہل پہل اس سڑک نے حاصل کر لی ہے۔ وہی چہچہے تھے اور وہی غلغلے۔

دو فرلانگ تک اس خوبصورت اور بارونق معطر اور منور سڑک پر چلنے کے بعد کانگریس کے عام اجلاس کا وہ پنڈال ملتا تھا جس کو لکھنؤ کے نفاست پسندوں کا ایک جامع نمونہ کہنا چاہیئے۔ پنڈال جالی کا بنایا گیا تھا تاکہ ہوادار

بھی ہے اور خوشنما بھی۔ پنڈال کے تمام ستون چاندی کے تھے اور شب کا اجلاس کو شبنم سے بچانے کے لئے پنڈال کے اوپر ایک مخملی شامیانہ لگایا گیا تھا۔ جس میں ہر طرف خس کے پردے اس صنعت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے کہ اگر رات کا اجلاس ہو تو ان پردوں کو باندھ دیا جائے اور جالی سے چھن چھن کر تازہ ہوا آسکے اور اگر دن کا اجلاس ہو تو لوٹے حاضرین کو بچانے اور پنڈال کو خنک رکھنے کے لئے یہ پردے کھول دیئے جائیں۔ پنڈال میں ہر طرف رومی قالین اور مخملی گاؤ تکیے نظر آتے تھے۔ صرف صدر منتخب کے لئے اس پنڈال کے اندر کارچوبی شامیانہ لگایا گیا تھا جس کے نیچے زرتار مسند اور تکیہ تھا اور سامنے ہی قد آدم ایک سونے کا پیچوان اور سونے کے خاصدان کے قریب گنگا جمنی کا اُگال دان رکھا ہوا تھا۔ صدر کے علاوہ تمام حاضرین اور شرکار اجلاس کے لئے چاروں طرف چاندی کے خاصدان اور پیچوان رکھے گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور اُگال دان نہایت سلیقہ اور قرینے سے سجائے گئے تھے۔ وسط میں گلدانوں کی قطار اس طرح تھی کہ ہر گلدان کے بعد اگر کی بتیاں اور دیگر اقسام کی خوشبو جلانے کے لئے چنگیر رکھے ہوئے تھے۔ اور ہر چنگیر کے بعد ایک گلدان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر موم بتیوں کے لالے روشن تھے اور پنڈال کو موم بتیوں کے ہزاروں جھاڑوں

اور قندیلوں سے منور کر دیا گیا تھا۔

اجلاس کا وقت ۸ بجے شب مقرر ہوا تھا مگر ۹ بجے شرکا نے آنا شروع کیا اور دس بجے کے قریب تمام پنڈال معززین حاضرین سے بھر گیا اور ٹھیک سوا دس بجے پہلا گولا چھوٹا۔ پھر روشن چوکی نے ایک ترانہ گایا اور آخر میں نقیب نے بھرے پنڈال میں آکر آواز لگائی ؎

نگہ دار۔ ہوشیار۔ آتے ہیں

صدر عالی وقار۔ آتے ہیں

یہ سنتے ہی تمام حاضرین بزم کھڑے ہو گئے اور پنڈال کے صدر دروازہ سے زرق برق لباس پہنے ہوئے پہلے تو چوبدار داخل ہوئے اور درمیان میں صدرِ محترم تاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح خراماں خراماں تشریف لائے۔ ہر طرف سے لوگوں نے جھک جھک کر سلام کئے اور خود صدر محترم نے سب کے سلاموں کا جواب جھک جھک کر، آداب بجالاکر، اور تسلیمات عرض کر کے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور مسکرا مسکرا کر دیا۔ اس کے بعد صدر محترم اپنی جگہ پہ رونق افروز ہوئے اور آپ کے تشریف فرما ہوتے ہی تمام حاضرین بزم قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر دوزانو بیٹھ گئے اس کے بعد اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہونے

سے پہلے ہی مجرا شروع کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک لکھنؤ کی مشہور مغنیہ حسنو جان نے موسیقی کے کمالات دکھا کر حاضرین محفل کو مسحور کیا۔ اس کے بعد بنارس اور آگرہ کی دو چوکیاں بیٹھیں۔ آخر میں میاں مصطفےٰ حسین کا مردانہ طائفہ آیا جس نے دور دور سے آئے ہوئے مندوبین کانگریس کو لکھنؤ کے بھانڈوں کا گرویدہ بنا دیا۔ اس نغمہ و رقص کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی اس طرح شروع کی گئی کہ صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین بزم میں سے ایک ایک سے اجازت طلب کرنے کے بعد اور آخر میں صدر محترم سے ہاتھ جوڑ کر اجازت طلب کر کے اپنا خطبہ اس شعر سے شروع کیا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کو پڑھتے ہی تمام پنڈال "ماشاء اللہ اور کیا برمحل صرف ہے اس شعر کا" کے نعروں سے گونج اٹھا اور صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ ملتوی کر کے ہر طرف گھوم گھوم کر سلام شروع کر دیئے اور مکرر ارشاد کے حکم کی تعمیل میں اس شعر کو پھر پڑھا۔ اور شعر کے بعد اپنا خطبہ جو مقفیٰ اردو میں تحریر کیا تھا شروع

کیا۔ اس خطبہ کے ایک ایک حصّہ پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی تھی اور صدرِ مجلسِ استقبالیہ کا ہاتھ گویا سلام کرنے کی کمانی دار مشین بنا ہوا تھا۔ یہ خطبہ گو بہت مختصر تھا۔ مگر مکرّر ارشاد کے تقاضوں اور خطیب کے سلام کرنے اور داد وصول کرنے کے وقفوں کی وجہ سے ایک گھنٹہ میں ختم ہوا اور خطبہ کے ختم ہونے کے بعد بھی تحسین و آفرین کا سلسلہ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد صدرِ محترم کھڑے ہوئے اور آپ کے کھڑے ہوتے ہی حاضرین بزم نے بھی کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ مگر صدرِ محترم کے اشارے سے سب پھر بیٹھ گئے۔ اب صدرِ محترم نے حاضرین سے ہاتھ جوڑ کر اپنا خطبہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی جس کا جواب سب نے ہاتھ جوڑ کر "بسم اللہ" اور "سب ہمہ تن گوش ہیں" کے متفقہ نعروں سے دیا۔ آخر تین چار مرتبہ کھنکھار کر اور ریشمی رومال سے منہ صاف کرنے کے بعد صدرِ محترم نے فرمایا ؎

آسماں بارِ امانت نتواست کشید

اور اے حضور!

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ "اے سبحان اللہ" کا وہ فلک شگاف نعرہ بلند ہوا

ہے کہ خود صدرِ محترم بھی بھونڈے سے اُچھل پڑے اور پھر فوراً سنبھل کر آپ نے سلام کرنے شروع کر دیئے۔ تین چار مرتبہ حاضرین محفل کے اصرار سے اسی شعر کو پڑھنا پڑا، پھر بھی حاضرین نے یہی کہا کہ حضور سیری نہیں ہوئی ایک مرتبہ اور مرحمت فرمایئے آخر صدرِ محترم نے پھر یہی شعر پڑھا اور شعر پڑھنے کے بعد اپنا خطبہ شروع کیا:۔

"ہر چند کہ یہ خاکسار فرائضِ صدارت سے ناچار تھا۔ خود بھی علیل تھا اور بستر بھی اس ہیچمدان کا بیمار تھا۔ مگر آپ حضرات کا اصرار، اور پھر اس پر اصرار کی تکرار، مجبوراً مزید انکار سے قاصر ہوا۔ اور افتاں و خیزاں تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوا۔

حاضرین نے "کیا سلاست ہے اور کیا روانی ہے" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے جھک جھک کر کلام کا تمام لوچ سلاموں میں صرف کرنے کے بعد پھر فرمایا:

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم کھاتا ہوں بلکہ باواجان مرحوم کی روح پاک کو درمیان میں لاتا ہوں کہ میں ہرگز اس اعزاز کے قابل نہ تھا اور انکار میرا کسرِ نفسی میں شامل نہ تھا۔ مگر آپ حضرات نے اس کو عذرِ لنگ جانا اور میرا کوئی حیلہ صحیح نہ مانا۔ مختصر یہ کہ اپنی تمام مجبوریوں کو بھول جانا پڑا اور کشاں کشاں جانبِ بزم کانگریس آنا پڑا۔

حاضرین نے پھر "حضور واللہ ہے کہ موتی پرو دیئے ہیں اور جواہرات جڑ دیئے

ہیں" کی صدائیں بلند کیں اور صدرِ محترم نے ہاتھوں کو جوڑ کر "آپ عزت بڑھاتے ہیں" کہہ کر فرمایا :-

" آج ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے۔ وہ کوشش کے بعد آسان اور بغیر کوشش کے سخت محال ہے "

حاضرین نے ہم آواز ہو کر کہا :-

" کیا کلیہ بیان فرمایا ہے حضور نے "

صدرِ محترم نے پھر مجرا بجالا کر ارشاد فرمایا :-

" باہمی اتفاق، یعنی سدِ باب نفاق و شقاق، از بس ضروری ہے۔ اور بغیر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں سخت مجبوری ہے۔ ہماری راہ پُر خطر اور دشوار ہے منزل دُور ہے اور راستہ ناہموار ہے۔ مگر کچھ بھی ہو اب تو مٹنا ہے اور مٹانا ہے یعنی بہر صورت مقابلہ کر کے آزمانا ہے۔ اگر ہمارے ارادوں میں استقلال ہے تو سمجھ لیجیے کہ درخشاں نیرِ اقبال ہے "

" آمین آمین۔ آپ کے منہ میں گھی شکر " کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ صدر نے پھر فرمایا :-

" ہم کو آج یہ طے کرنا ہے کہ اب ہم کو زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے : ذلتوں کی

انتہا ہو گئی۔ تکلیف حد سے سوا ہو گئی۔ ہم شہزادے سے ہو کر باٹ باٹ کا محصول اور لگان ادا کریں۔ ہم سے محصول اور لگان مانگنے والے روا خدا کریں کہنا یہ ہے کہ ہم پیٹ کاٹ کر اور بٹیروں کی پالیاں بند کر کے مالیہ کی ادائیگی کا انتظام کریں گو یا ہم اپنی جان سے دور رجان شے دیں اور بٹیریں نصیب اعداء مریں۔"

حاضرین نے "دو ریار چھائیں چھوبیں دیو" کا نعرہ بلند کیا اور صدر محترم نے پھر اپنا خطبہ شروع کیا۔ اس خطبہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی شکایتیں تھیں کہ جب حکومت ہماری ہے اور ہم خود مختار ہیں تو ہم مرغ کی پالیوں کا ٹیکس، بٹیر بازی اور کنکوے بازی وغیرہ کے محاصل کیوں ادا کریں۔

یہ خطبہ صدارت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا اور آخر میں جناب صدر نعرہ ہائے تحسین و آفرین کے درمیان سلام کرتے ہوئے تھک کر خستہ ہو کر پسینہ پسینہ ہو کر بیٹھ گئے، چوبداروں نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ کوئی برف لے کر دوڑا، تو کسی نے خاصدان پیش کیا۔ الغرض پندرہ منٹ کے بعد صدر محترم کے حواس بجا ہوئے اور اس کے بعد اجلاس کی ایجنڈے کے

مطابق کارروائی شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دربارِ شاہی میں نیابت کا مسئلہ تھا۔ شاہی خاندان کے دیگر نواب زادگانِ وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی دربار میں کرسی نشینی کے ۳۳ فیصدی حقوق دیئے جائیں۔ چنانچہ نواب زادگانِ اودھ کی طرف سے جس وقت اس سوال کو لے کر نواب دلار ے مرزا صاحب کھڑے ہوئے ہیں اور حاضرینِ محفل کو جھک جھک کر سلام کیئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیر اپنے خدمتگار کو دیا۔ اس کے بعد اب مدلل منطقی اور مسجع تقریر میں دربارِ شاہی میں اپنے ۳۳ فی صدی حقوق پر زور دیا اور آدھ گھنٹہ تک تقریر کرنے کے بعد شہزادہ والا تبار برہان الدولہ نواب فلک رفعت بہادر کھڑے ہونے والے تھے لہٰذا خدمتگار نے فوراً آئینہ پیش کر دیا۔ آپ نے آئینہ میں ٹوپی کو درست کر کے اور مونچھوں کا تاؤ ٹھیک کرنے کے بعد ایک گلوری نوش فرمائی اور اس کے بعد کھڑے ہو گئے ہر طرف سے "یا علی" اور "بسم اللہ" کا نعرہ بلند ہوا۔ جس کے جواب میں آپ نے حاضرین کو سلام کرنے کے بعد فرمایا۔

"اے حضرت میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اختلاجِ قلب کا پرانا بیمار ہوں۔

آپ کو معلوم ہے بھائی دلارے مرزا عرف لاڈلے نواب میرے دوست ہیں لیکن سچ پوچھیئے تو میرے گوشت اور پوست ہیں مگر آج انہوں نے غیروں سے بڑھ کر مغائرت سے بھری ہوئی تقریر کی ہے۔ یعنی اپنے اور میرے دوستانہ مراسم کی تحقیر کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر حقوق میں بیعہدی کا کیا سوال ہے دوستی میں تو سب کا یکساں حال ہے۔ وہ سر آنکھوں پر دربار میں تشریف لائیں۔ اور اگر کوئی کرسی خالی نہ ہو تو ہمارے دل میں جگہ پائیں۔ مگر خدا کے لئے یہ غیریت نہ فرمائیے اور بسر و چشم دربار میں تشریف لائیے" نواب فلک رفعت سلام کر کے بیٹھ گئے اور اس کے بعد نواب دلارے مرزا جو کھڑے ہونے والے تھے مگر تسبیح دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھٹک گئے اور آخر کھڑے ہو کر صرف اتنا کہا کہ میں کچھ عرض کرتا ہوں مگر استخارہ مانع آ رہا ہے۔ گویا بھائی صاحب نواب فلک رفعت کی من جانب اللہ تائید ہو رہی ہے۔ لہذا یہاں بھی سر تسلیم خم ہے۔

ایجنڈے میں اب آزادی کامل کی تجویز تھی۔ امید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہوگئی مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کونسی جماعت لائے۔ نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:-

"حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں"

"شہزادوں نے کہا" نہیں پہلے آپ"

نواب زادوں نے کہا" پہلے آپ"

شہزادوں نے کہا" واللہ یہ نہ ہوگا۔ پہلے آپ، آخر اسی پہلے آپ اور نہیں حضرت پہلے آپ میں صبح ہوگئی اور اجلاس ختم ہوگیا۔

اس طلسمِ خیال کو توڑیئے اور بتایئے کہ ایسی حسین کانگریس کے مقابلہ میں جس کا نازک بدن تصوّر جوف دماغ میں محدود و تخیّل رہ گیا ہے۔ ہم کو باوجود تمام زیبائشوں اور رونقوں کے یہ کھدر قسم کی کانگریس کیونکر پسند آسکتی تھی یا کسی ایسے شخص کو اس قسم کا کانگریس سیشن کیونکر پسند آسکتا ہے جس کا دماغ عہدِ پارینہ کے تصوّر سے معطّر ہو رہا ہو۔"

خدا سر دے تو سودا دے

"عاشق بننے کے لئے نہ بی۔ اے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے نہ ایم۔ اے ہونے کی، نہ صاحب جائداد کی قید ہے نہ شریف خاندان کی۔ جس کو اللہ توفیق دے عاشق بن سکتا ہے اور جس طرح شیلے، شکسپیئر، غالب، مومن، حافظ وغیرہ کا نام ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اسی طرح مجنوں اور فرہاد اور اُن کی طرح دوسرے عاشقوں کا نام دس مرتبہ ایک غزل میں آنے کا قانوناً مستحق ہو جاتا ہے۔ آخر مجنوں بھی آدمی تھا فرہاد بھی ہماری طرح انسان تھا اور دونوں میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہوئے تھے کہ آج تک ہر شاعر جب تک

اُن کا نام لے کر غزلیں شروع نہ کرے شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ نہ پڑھے لکھے تھے نہ ایسے مالدار تھے۔ نہ اُن کے حسن میں کوئی خاص بات تھی بلکہ اگر سچ پوچھیے تو اُن سے زیادہ پڑھے لکھے مالدار، خوبصورت نہ سہی مگر خیر پھر بھی انسان کی صورت کے ہم خود ہیں جب اُن لوگوں نے عشق کر کے ایسا نام حاصل کر لیا تو کیا ہم یہ بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم سے اب دنیا کا کوئی کام نہ ہو گا"

بدھن کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات کا ایک طوفان موجزن تھا اور وہ اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ اُسے سڑک پر لیٹا ہوا کتّا بھی دکھائی نہ دیا۔ کتّے پر پیر پڑا اور اس کی "بھوں بھوں" نے تمام محویت کے نشہ کو ہرن کر دیا۔ اُچھل کر ایک دکان پر چڑھ گئے، خیریت ہوئی کہ کتّے نے کاٹا واٹا نہیں۔ لیکن اگر یہ حادثہ پیش نہ آجاتا تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے بدھن نہ معلوم کب کے عاشق بن چکے ہوتے۔ کتّے پر پیر پڑ جانے سے خیالات پریشان ہو گئے۔ لیکن اس عاشق بن جانے کی اسکیم پر اطمینان سے غور کرنے کا ارادہ کر کے گھر پہنچے اور اچکن وغیرہ اُتار کر اسی فکر میں چارپائی پر لیٹ گئے۔ بدھن اس مسئلہ پر جتنا جتنا غور کرتے تھے۔ اُن کی اُمیدیں بڑھتی جاتی تھیں اور ہر پہلو سے عاشق

بن جانا اچھا ہی نظر آتا تھا مگر پھر انھوں نے سوچا کہ لاؤ ذرا بیوی سے بھی مشورہ کر لیں۔ ایک سے دو کی رائے مناسب ہوگی، ممکن ہے کہ وہ کوئی بہتر بات بتا دیں۔ بہر حال یہ ایک لاجواب ترکیب ہے اور بالکل الہامی طریقے سے ذہن میں آئی ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انسان کے دن پھرنے والے ہوں تو خود بخود اس کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کیا خدا کی قدرت ہے۔ دیکھیں بیگم کیا کہتی ہیں؟

"سنتی ہو؟ —— ارے سنا؟ —— ذرا سنو تو سہی" بیگم صاحبہ طلبی پر ہانڈی چولھا چھوڑ کر فوراً حاضر ہو گئیں اور بڈھن کے چہرے پر خلافِ معمول تازگی اور چمک دیکھ کر خود بھی سوالیہ نشان بن گئیں کہ یہ کیا بات کہنے ہیں۔

بڈھن نے نہایت اُمید افزا چہرہ بنا کر کہنا شروع کیا:۔

"ذرا قریب بیٹھو۔ آج ایک ترکیب سوجھی ہے وہ لاجواب کہ واللہ تم بھی کیا کہو گی۔ تم کہا کرتی ہو کہ تم سے کچھ نہ ہوگا۔ یونہی بیکار بیٹھے رہو گے اور یہ اور وہ مگر آج دیکھو میں نے کیا ترکیب نکالی ہے"

بیگم "کہو گے بھی یا بس تعریفیں ہی ہوا کریں گی میرا گوشت جلا جاتا ہے۔ ابھی ڈوئی

پکانے کو پڑی ہے۔"

بڈھن۔" اجی لعنت بھیجو گوشت کو اور چولھے میں ڈالو روٹی کو تم اطمینان سے سنو جو کچھ میں کہتا ہوں میں نے وہ ترکیب سوچی ہے کہ جب تک دنیا ہے میرا نام باقی رہیگا اور بڑے بڑے لوگ میرے نام کا وظیفہ پڑھیں گے۔"

بیگم۔" توبہ ہے کسی طرح بات ختم ہی نہیں ہو سکتی!"

بڈھن۔" سنو تو سہی تم تو بات کاٹ دیتی ہو بھلا تم نے مجنوں کا نام بھی سُنا ہے؟"

بیگم۔" ہاں سُنا ہے پھر؟"

بڈھن۔" اگر اسی طرح میں بھی عشق کر لوں تو کہو کیسی رہے؟ ہزاروں لاکھوں برس تک لوگ مجھ کو نہ بھولیں گے۔ وہ شہرت ہوگی کہ تم بھی یاد کرو گی۔"

بیگم۔" اے تمہیں خدا سمجھے ایسی عقل پہ پتھر پڑیں جو بات کی موئی اوندھی جان بوجھ کر اپنے کو سڑی بنا رکھا ہے۔ میری قسمت میں تمہارا ایسا خبطی لکھا تھا خدا اس سے تو مجھے موت دے دیتا۔ خدا میرے ماں باپ کی روح خوش کرے جنہوں نے میرا پلّا ایسے سودائی سے باندھا ہے۔"

بڈھن۔" ہائیں ہائیں۔ کچھ عقل ماری گئی ہے۔ کچھ پاگل ہوگئی ہو یعنی میں نے تو ایک اچھی بات کہی اسکی داد یہ ملی کہ سڑی، سودائی اور نہ معلوم کیا کیا بنا ڈالا

واللہ تم سے بھی بات کہہ کے طبیعت خوش نہیں ہوتی۔ عجیب بیوقوف قسم کی عورت ہو۔ جاؤ تم اپنا گوشت پکاؤ۔ تم سے ایسی باتوں میں مشورہ لینا ہی میری حماقت تھی لاحول ولاقوۃ۔"

(۲)

حالانکہ بیوی سے سخت مخالفت ہو چکی تھی مگر بدھن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ عاشق بن جانا ہی اس کا ایک علاج باقی رہ گیا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہوا تو پھر ڈوب مرنا چاہیئے۔ خدا کی شان مجنوں اور فرہاد ایسے جاہل کندۂ ناتراش عاشق بن جائیں اور بدھن کچھ نہ بنے مگر جب تک یہ بات ذہن میں نہیں آئی تھی اسی وقت تک کی دیر تھی اب تو اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ عشق کروں گا اور عاشق بن کر رہونگا۔ مگر سوال یہ تھا کہ عشق کرنے میں کم از کم ایک معشوق کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہاں سے لایا جائے لیکن اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب وہ عشق کرنے پر تیار ہو گیا تو خدا مسبب الاسباب ہے معشوق مل ہی جائیگا۔ ایک مرتبہ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ لاؤ بیوی سے عشق کر لیں مگر پھر خود ہی اس خیال پہ ہنسی بھی آئی کہ اپنی بیوی سے خود ہی عشق کرنا کس قدر مہمل بات ہے جیسے اپنا شعر پڑھ کر خود ہی سبحان اللہ کہہ دینا اور پھر خود ہی سلام کر لینا یا اپنی دعوت

خود ہی کرنا اور خود ہی مدعو ہو جانا، عشق بیوی سے نہیں کیا جاتا بیوی سے تو نکاح ہوتا ہے اور عشق ہوتا ہے معشوق سے۔ لہٰذا یہ عشق کا قصہ اس وقت تک کیلئے ملتوی کر دیا گیا جب تک کوئی مناسب سا معشوق نہ ملے اور معشوق کی جستجو شروع کر دی۔ جستجو جس چیز کی بھی کی جائے اس کا نہ ملنا کیسا؟ ہاں ڈھونڈنے والا چاہیئے۔ بڈھن نے معشوق کی جستجو میں سارا شہر چھان مارا، کوئی گلی کوئی کوچہ نہ چھوٹا آخر کار معشوق مل کر رہا لیکن ذرا گھر سے دُور۔ خیر اس سے کیا ہوتا ہے۔ عشق کے نزدیک فاصلہ واصلہ کوئی چیز نہیں۔ مجنوں تو نجد کے معلوم نہیں دن بھر میں کتنے چکر لگاتا تھا اور ذرا بھی نہیں تھکتا تھا۔ چہ جائیکہ اتنا سا فاصلہ کہ چار پیسے دیئے اور کھٹ سے اکّے پر بیٹھ کر کوچۂ جاناں میں جا پہنچے تھوڑی دیر عشق کیا اور پھر واپس آ گئے۔ دو تین روز تک بڈھن اسی طرح آتے جاتے رہے لیکن ابھی ان کو عشق کرنا نہیں آتا تھا۔ آخر ایک دن غور کیا کہ عشق کس طرح کریں معشوق بھی خدا کے فضل سے مل گیا ہے اور عاشق بھی ہم ہیں۔ لیکن عشق کرنے کا طریقہ تو معلوم ہونا چاہیئے۔ یہ سوچ کر قصہ لیلیٰ مجنوں شروع سے آخر تک رات بھر میں پڑھ ڈالا اور نہایت غور سے پڑھا۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اپنے بیٹھکے میں آئے اور عاشق کی صورت بنانا شروع کی۔ اچکن اُتاری، قمیض کو اُتار کر پھینک

دیا۔ صرف گربیان گلے میں ڈال لیا۔ پاجامے کو لنگوٹی کی شکل میں پھاڑ کر باندھ لیا اور ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکل کر اکیے کی تلاش میں چلے۔ لیکن کوئی اکیہ والا بٹھانے پر راضی نہ ہوا۔ ایک آدھ سے لڑائی بھی ہو گئی۔ یہ لاکھ کہتے رہے کہ "بے جانتا نہیں ہے کہ ہم عاشق ہیں" لیکن کسی نے ایک نہ سُنی، کوئی ہنستا، کوئی مذاق اُڑاتا رہا۔ بہرحال سب نے متفقہ طور پاگل سمجھ کر ان کو اکیہ پر نہ بٹھایا اور مجبوراً بیچارے کو پیدل جانا پڑا۔ راستہ میں کُتّے بھونکے۔ لڑکوں نے ڈھیلے مارے۔ لوگوں نے مذاق کیا۔ لیکن یہ اپنی رَو میں سیدھے کوچۂ یار میں آکر ٹھہرے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آج کچھ کچھ عشق رنگ لایا ہے۔ اس لیے کہ مجنوں پر بھی شروع شروع میں کتے بھونکے تھے اور یہی تمام واقعات گذرے تھے۔ جب عشق کے رنگ لانے کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو معشوق کی کھڑکی کے نیچے پہنچے اور اظہارِ عشق کا عزم بالجزم کر لیا ایک کوئلہ سے کاغذ پر لکھا۔ ؎

"مرتا ہوں ترے عشق میں اے یار خبر لے"

اور کاغذ کو ایک پتھر میں باندھ کر سیٹھ جی کی لڑکی پر پھینک دیا۔ کاغذ تو ہوا سے اُڑ گیا۔ لیکن پتھر پیغامِ عشق لیکر سیدھا پیشانیٔ معشوق پہ جا کر اس طرح لگا کہ خون بہنا شروع ہو گیا اور "ہائے مار ڈالا، ہائے مار ڈالا" کی آواز سے سارا محلہ جمع ہو گیا۔

بڈھن معشوق کی ان اداؤں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ معشوق کی انگلی کے ایک اشارے سے چار پانچ آدمیوں نے عاشق کو گرفتار کر لیا۔

(۳)

پولیس کی چوکی بھی عجیب و غریب جگہ ہوتی ہے اور پھر ایک عاشق کیلئے وہاں کسی بات میں شعریت ہی نہیں۔ بس "ابے تبے" کر کے معاملات کی باتیں پوچھ لیں اور حوالات میں بھیجدیا۔ نہ کسی کے احساسات کا خیال نہ لطیف جذبات کا پاس۔ بس ان کو تو اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ بڈھن کو بھی وہاں جا کر قلبی اذیت ہوئی۔ جس کو دیکھئے "ابے تو کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا نام ہے؟ تو نے کیا کیا؟ بولتا ہے کہ نہیں؟" یہی کہہ رہا ہے۔ اب کوئی ان سے کیا کہے کہ جس سے تم اس طرح مخاطب ہو وہ کس مرتبہ کا انسان ہے ایک آدھ مرتبہ بڈھن نے کہا بھی کہ "بھائی ہم عاشق ہیں عاشق"، مگر اس پر کسی نے کان بھی نہ دھرے بس یہی پوچھا کئے "عاشق علی یا عاشق حسین؟" اب ان کو کون سمجھاتا کہ عاشق کے لئے صرف عاشق کہہ دینا ہی کافی ہے۔ جب ان کا اس طرح اطمینان نہ ہوا تو کہا کہ "بھائی ہم عاشق ہیں۔ ہمارا نام بڈھن ہے۔" کسی نے سن کر کہا "سڑی ہے" کوئی بولا "بنتا ہے" کسی نے رائے قائم کی کہ "بدمعاش ہے" کسی کا خیال ہوا

کہ "خفیہ پولیس ہے"۔ ایک لال بجھکڑ نے بہت غور کے بعد کہا کہ "انقلاب پسند جماعت کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بم باز ہے" آخر ایک صاحب نے گھر کا پتہ پوچھا، تو بتادیا گیا۔ انہوں نے کہا۔ ہم ابھی چلیں گے ہم کو چل کر اپنا مکان بتاؤ۔ بڈھن نے کہا "بسم اللہ چلئے آپ کا گھر ہے"۔

پولیس کے سپاہیوں میں گھرے ہوئے بیچارے بڈھن اپنے گھر پہنچے مگر گھر میں نہ جانے پائے، بیوی کو خبر ہوئی تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ محلہ والوں نے شناخت کی اور سب نے متفقہ طور پر یہی رائے دی کہ "بیچارہ اچھا خاصہ تھا آج ہی دماغ خراب ہوگیا"۔ بیوی نے کہا "نہیں دماغ میں کل شام سے کچھ خلل ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں مجنوں کی طرح عشق کرکے نام کرلوں۔ کیا رکھا ہے ——— ؟"

بیوی کی آواز سن کر بڈھن کو پھر غصہ آیا اور کہنے لگے:۔

" پاگل ہو تم تمہارا کیا ؟ یہ دماغ کی خرابی کی بات ہے یا نام پیدا کرنے کی ترکیب ہے، تم نے کل بھی جہالت کی باتیں کی تھیں اور آج بھی وہی حماقت تم سے کون پوچھ رہا ہے۔ تم جاؤ کھانا پکاؤ۔ کسی کا کیا اجارہ ہے۔ ہم نے عشق کیا اچھا کیا، خوب کیا اور کریں گے، ہزار مرتبہ کریں گے دیکھیں تو ہمارا کیا کرتی ہو ؟"

بیوی! "ہائے اپنی گت تو دیکھو۔ ہائے میں لٹ گئی"

بڈھن: "گت کیا دیکھیں عاشقوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ تم تو ماشاء اللہ پڑھی لکھی ہو ذرا قصہ لیلیٰ مجنوں اٹھا کر دیکھو کہ مجنوں جس کا آج ڈنکا بج رہا ہے کس شان سے رہتا تھا۔"

بیوی: "ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میں کہیں کی نہ رہی"

بڈھن: "اس میں لٹنے کی کونسی بات تھی ایک قمیص میں نے اپنے شوق کیلئے پھاڑی تو یہ لٹ گئیں تم کو میرا عشق ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو جانے دو۔ میں نہیں کرونگا عشق، لاؤ کوئی پاجامہ بکس میں سے نکال دو، مگر اب مجھ کو بیکاری کا طعنہ نہ دینا۔"

بیکاری

بیکاری یعنی بے روزگاری اس اعتبار سے تو نہایت لاجواب چیز ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی حیثیت کا انسان اپنے گھر میں تمام دُنیا سے بے نیاز ہو کر اس طرح رہتا ہے کہ ایک شہنشاہ ہفت اقلیم کو اپنے محل میں فارغ البالی نصیب نہیں ہو سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دولت جس کو دنیا کے سرمایہ دار اپنی جان اور اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مستقل عذاب ہے جو انسان کو کبھی مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ سرمایہ داروں کی تمام زندگی بس دو ہی فکروں میں کٹتی ہے ایک یہ کہ کس طرح تمام دُنیا کا روپیہ ہمارے خزانہ میں آجائے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہمارا

روپیہ چھوڑ بیٹے گئے تو کیا ہوگا؟ یہ دونوں فکریں اپنی اپنی جگہ ایسی مہلک ہوتی ہیں کہ ان کو بھی دق کی منجملہ دیگر اقسام کے سمجھنا چاہیئے بلکہ دق کی دوسری قسمیں تو معمولی ہیں مثلاً پھیپھڑے کی دق، آنتوں کی دق، ہڈی کی دق، وغیرہ مگر یہ فکریں دل اور دماغ کی دق سے کم نہیں۔ جن کا مارا ہوا نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے بس توند بڑھتی جاتی ہے اور دل چھوٹا ہوتا رہتا ہے مختصر یہ کہ ان سرمایہ داروں کی زندگی حقیقتاً جبرو اختیار میں بسر ہوتی ہے کہ نہ زندہ رہتے بن پڑتی ہے نہ مرنے کو دل چاہتا ہے اب رہے غریب ان کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ بلا ضرورت پیدا ہو گئے۔ اور جب جی چاہا مر گئے۔ نہ جینے کی خوشی تھی نہ مرنے کا کوئی غم۔

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مطلب کہنے کا یہ کہ چاہے ہم کو بے روزگاروں کی جماعت گالیاں دے یا سرمایہ داروں کا طبقہ انعام، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ دنیا کے لئے بیکاری ایک رحمت ہے۔ حالانکہ اس رحمت سے ہندوستان کے علاوہ تمام دنیا کے ممالک چیخ اُٹھے ہیں اور ہر طرف سے "ہائے پیٹ ہائے پیٹ" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ "ہائے پیٹ" کی صدائیں "پیٹ پھٹا" کی صداؤں کے مقابلہ میں پھر بھی قابلِ برداشت ہیں، لوگ کہیں گے کہ عجیب الٹی

سمجھ کا آدمی ہے کہ تر لقمے پر فاقے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن جناب ہم اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں کہ فاقہ اُسی وقت تک فاقہ ہے جب تک تر لقمے کی اُمید انسان کے پیٹ کو جہنم اور معدے کو ربڑ کا بنائے ہوئے ہے لیکن اگر انسان تر لقمے سے خالی الذہن ہو جائے تو یہی فاقہ اُس کے لئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب مرحوم نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی قسم کی ایک بات کہی ہے جس کا ترجمہ ہمارے الفاظ میں یہ ہوا کہ ؎

فاقہ کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتی ہے بھوک

اس قدر فاقے پڑے ہم پر کہ لقمہ ہی گئے

ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ معمولی سمجھ کے انسانوں کے لئے بیکار ہے لہٰذا اس کا کہنا بھی فضول سی بات ہے اور نہ اس وقت ہم اس قسم کی بلند باتیں کرنا چاہتے ہیں ہم تو اس وقت بیکاری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جس کے خلاف تمام دنیا میں احتجاج کا ایک شور مچا ہوا ہے بیکاری اچھی چیز ہے یا بُری اس کے متعلق ہم اپنے ذاتی خیال کو اگر تفصیل کے ساتھ پیش کریں تو ہم کو اندیشہ ہے کہ یا تو ہماری جان خطرے میں پڑ جائے گی ورنہ یہ تمام دنیا کی تجارت، کاروبار اور ملازمتیں وغیرہ سب مفلوج ہو کر رہ جائیں گی۔ لہٰذا دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ذرا ڈر معلوم ہوتا ہے معلوم نہیں بھلا

اونٹ کس کروٹ بیٹھے اس لئے بہترین صورت یہی ہے کہ عام نقطۂ نظر سے ہم بھی بیکاری کو بُرا فرض کرنے کے بعد اپنے "خامہ" سے چل "بسم اللہ" کہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ نئی اور پرانی دنیا ملا کر جو کرۂ ارض بنتا ہے۔ اس میں تین چوتھائی تو "بحر الکاہل" "بحر الغافل" "بحر الجاہل" وغیرہ کی قسم کے بڑے بڑے سمندر میں یعنی پانی ہی پانی۔ اب رہ گئی ایک چوتھائی دُنیا جو عام نظر سے بچ جانے خشکی ہے۔ اس ایک چوتھائی دنیا میں لق و دق صحرا ہمہ لغایت پہاڑ، ریگستان جن کو انسان سے کوئی تعلق نہیں، بس "مقتر ستان" کہنا چاہیئے، اور جھیلیں دریا، نالے وغیرہ ہیں۔ باقی جو بچی تھوڑی سی خشکی اس میں کھیت اور باغ وغیرہ سے بچی ہوئی خشکی کو گاؤں، تحصیل، پرگنہ، شہر، ضلع، صوبہ، ملک اور برّ اعظم وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور یہ ہے وہ مختصر سی گنجائش جس میں جناب اشرف المخلوقات مع چرندوں، پرندوں، درندوں کے رہتے ہیں۔ اس محدود گنجائش میں آبادی کا یہ حال کہ خدا کی پناہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے، دُنیا کی وسعتیں محدود ہیں اور نسلِ انسانی کی ترقی غیر محدود۔ اب جو لوگ بیکاری کا رونا روتے ہیں تو آپ ہی بتایئے کہ یہ دُنیا کا قصور ہے یا دُنیا کے بسنے والوں کا۔ ہاں اگر نظام فطرت یہ ہوتا کہ ہر انسان کے ساتھ ساتھ ایک آدھ بیگھہ زمین بھی پیدا ہوا کرتی تو واقعی بیکاری کے متعلق

ہماری تمام شکایتیں حق بجانب تھیں مگر اب تو ہر نیا پیدا ہونے والا اس چھوٹی سی دنیا میں گنجائش حاصل کر لینا چاہتا ہے جو باوا آدم کے وقت سے لے کر اب تک یعنی از آدم تا ایں دم ایک انچ بھی نہیں بڑھی آپ کہیں گے واہ بڑھی کیوں نہیں۔ یہ جو کولمبس نے امریکہ کا پتہ لگا کر اس دنیا میں ایک اور اضافہ کیا وہ کدھر گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ پہلے سے موجود تھا۔ جب تک انسان کی جستجو میں کامیاب ہونے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی وہ پوشیدہ رہا اور جب اس کو ڈھونڈھا گیا تو وہ مل گیا۔ لیکن اب یہ اُمید رکھنا کہ کوئی امریکہ پایا جائے گا غلط ہے۔ اس لئے کہ اب انسان کو بیکاری کے غم نے یا تو اس قدر پست ہمت کر دیا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالنے میں بھی کاہلی سے کام لیتا ہے یا سرمایہ داری نے ایسا دماغ خراب کر دیا ہے کہ مریخ پر سلطنت کرنے کی فکر ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ ہوا میں قلعہ بنانے کی جدوجہد کامیاب ہو جائے۔ لیکن ابھی تو ہم دنیا سے جا کر مریخ میں آباد ہونے کے لئے تیار نہیں۔

لاحول ولا قوۃ کہاں سے کہاں پہنچے۔ ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے۔ کہ افزائش نسل کی کثرت نے دنیا میں بیکاری کی وبا پھیلا دی ہے۔ بات یہ ہے کہ بڈھے تو مرنے کا نام نہیں لیتے اور بچے پیدا ہونا بند نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی بڑھتی

جاتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ جہاں پانچ بچّے پہلے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہاں اب پانچ ہزار تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پہلے تو یہ تھا کہ یہ پانچ بچّے پڑھنے کے بعد پانچ جگہوں پر ملازم ہو جاتے تھے۔ ملازمت کرتے تھے۔ پنشن لیتے تھے اور مر جاتے تھے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ ملازمتیں تو وہی پانچ ہیں۔ لیکن ان کے اُمیدوار بجائے پانچ کے پانچ ہزار ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پانچ تو بدستور برسرِ بیکار ہو جائیں گے اب رہے چار ہزار نو سو پچانوے وہ یقینی طور پر بیکار رہیں گے۔ یہ غلطی دراصل حساب کی غلطی ہے کہ اب آمد و خرچ برابر نہیں رہا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اِدھر پانچ بچے پیدا ہوئے تو اُدھر پانچ بڈھے مر گئے۔ اِدھر پانچ امیدوار ملازم ہوئے تو اُدھر پانچ ملازموں نے پنشن لے لی۔ لیکن اب بڈھوں نے مرنا تک کم دیا ہے اور بچے برابر پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس صورت میں کوئی بڑے سے بڑا ریاضی دان ہم کو بتائے کہ حساب فہمی کا آخر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اب یہ دیکھئے کہ پانچ ہزار میں سے پانچ کے برسرِ روزگار ہو جانے کے بعد جو باقی بچے تھے چار ہزار نو سو پچانوے۔ وہ گویا سب کے سب بیکار ہوئے ان بیچاروں کا یہ حال ہے کہ خدا دشمن کا بھی نہ کرے۔ ہائے وہ طالب علمی کی امیدیں کہ بس پاس ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری اپنے گھر کی لونڈی ہے۔ فارغ التحصیل ہوئے اور

آنریبل بنے اگر گورنر نہیں تو ان کے باجلاس کونسل تو ضرور ہی ہو جائیں گے لیکن جب پڑھنے کے بعد درخواستیں بھیجنا شروع کیں تو ہر جگہ سے نامنظور ہو کر واپس ڈاک گھر پہ آگئیں۔ اب تبایئے کہ اس وقت وہ بیچارے کیا کریں۔ کوئی تو گھبرا کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔ کوئی تجارت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ کوئی ڈپٹی کلکٹری سے ناامید ہو کر ریلوے میں ٹکٹ کلکٹری کر لیتا ہے۔ کوئی بجائے آنریبل ہونے کے کلیریکل لائن میں نکل جاتا ہے اور زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو لیس ارادہ کرتے اور بدلتے ہیں۔ تجاویز پر غور کرتے اور رہ جاتے ہیں۔ اسکیمیں بناتے ہیں اور رد کرتے ہیں یعنی بس گھر پر بیٹھے ہوئے بچوں کو کھلاتے ہیں اور مزے کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو عام طور پر بیکار بے روزگار کہا جاتا ہے اور آجکل دُنیا ان ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

نصیحت کرنے والے جو اتفاق سے بیروزگاری کے آلام و مصائب سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ آجکل کے نوجوانوں میں آرام طلبی ایسی آگئی ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ بس وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ گھر پہ پڑے ہوئے چارپائی کے بان توڑا کریں اور روپے کی بارش ہوا کرے۔ ان تاہیچ بزرگوں سے اب کون کہے کہ "جناب والا یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے

کہ آپ کا سایہ ہم کمبختوں کے سر پر ہنوز قائم ہے حالانکہ آجکل عمرِ طبیعی بس پچاس پچپن سال ہے۔ یعنی پچپن سالہ کی پنشن پاتے ہی انسان کو مرنا چاہیئے۔ یعنی یہ زبردستی تو ملاحظہ فرمایئے کہ یہ دُہری دہری عمر طبیعی پانے والے بزرگ مرنا تو بھُول جاتے ہیں۔ بس یاد یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی نازل کی ہوئی مصیبتوں پر بیکار نوجوانوں کو دن رات لعنت ملامت کیا کریں۔ حالانکہ قصور سب ان ہی کا ہے۔ یہی نوجوان جب بچے تھے تو ان ہی قبرستان کا راستہ بھُول جانے والے بزرگوں نے ان بیچاروں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اور تمام زندگی زبردستی پڑھاتے رہے یہاں تک کہ پڑھانے والے تو قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے، اور پڑھنے والے ایک آدھ درجن بچوں کے باپ بن گئے۔ اب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں اور باپ دادا سب کا پیٹ پالو۔ تو بیچارے کہاں سے پالیں آرام طلب بنا دینے والے آرام طلبی کا طعنہ دیتے ہوئے کس قدر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ بیکار کر دینے والے بیکاری پر لعنت ملامت کرتے ہوئے کیسے بھلے لگتے ہیں۔ ان ناصحوں سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ کو اپنی اولاد کے باکار ہونے کی فکر تھی تو آپ نے اس کو درزی کیوں نہ بنایا، بڑھئی کیوں نہ بنایا، لوہار کیوں نہ ہونے دیا، جوتا بنانا کیوں نہ سکھایا۔ اور تعلیم شروع کرانے سے قبل گلا گھونٹ کر کیوں نہ مار ڈالا۔ پہلے تو تمام زندگی بیکار

ضائع کی، اسکول اور کالج کی "لاٹ صاحبانہ" زندگی بسر کرائی۔ سوٹ، بوٹ، لونڈر کا عادی بنایا اور اس مغالطے میں مبتلا رکھا کہ آنے والا دور موجودہ دور سے زیادہ زرّین اور خوشگوار ہے تو اب یہ شکوہ سنجیاں کیا معنی رکھتی ہیں اور تمام دنیا کا تو خیر جو کچھ بھی حال ہو لیکن ہندوستان جنت نشان کا یہ حال ہے کہ یہاں بیکاری کے سبب اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ گویا ہندوستانی انسان کا مقصد حیات ہی بیکاری ہے جس میں سب مبتلا ہیں۔ ہندوستان ایسے جاہل ملک کے پڑھے لکھے بھی دو کوڑی کے اور جاہل بھی دو کوڑی کے بلکہ جو بیچارے پیدائشی یعنی خاندانی جاہل ہیں اُن کی حالت پڑھے لکھوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لئے کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال لیتے ہیں اور پڑھے لکھوں کا پیٹ اُن کے متعلقین بھرتے ہیں۔ اس وقت بیکاری کا یہ حال ہے کہ ہندوستان کے کسی شہر میں دیکھ لیجئے بہت سے محلے کے محلے ایسے نکلیں گے جہاں آپ کی دعا سے سب خود مختار یعنی آزاد ہوں گے، کوئی کسی کا نوکر چاکر نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کھاتے کہاں سے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ بھی دنیا کے تمام کام چھوڑ کر ہاتھ پیر ہاتھ رکھ کے بیٹھ رہیئے اور دیکھئے کہ خدا کھانے کو دیتا ہے یا نہیں؟ پہلے آپ جائداد پر ہاتھ صاف کریں گے پھر بیوی کے زیور کی باری آئے گی۔ پھر کپڑوں اور

بزرگوں پر نوبت پہنچے گی۔ مختصر یہ کہ خدا باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت اور جہیز کی ہوئی گھرستی کو رکھے، بیوی کے لائے ہوئے زیور کو رکھے، اور ان سب کو کوڑیوں کے مول خریدنے والے مہاجنوں کو رکھے، بہر حال آپ انشاء اللہ اچھے سے اچھا کھائیں گے اور جس قدر اچھی زندگی آپ کی گزرے گی۔ وہ تو ان نوکری پیشہ قسم کے بیروزگار لوگوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی۔

مطلب کہنے کا یہ کہ جس بیکاری سے ایک دنیا چیخ اٹھی ہے۔ اس سے ہندوستان کیوں گھبراتا ہے۔ ہندوستان تو بقول ہمارے خداوندانِ نعمت کے ایک جاہل، وحشی، غیر مہذب اور کالے آدمیوں کا ملک ہے۔ یہاں اگر بیکاری ہے تو کیا تعجب۔ جب یورپ ایسے متمدن، تعلیم یافتہ، مہذب اور گورے آدمیوں کے ملک میں یہ حال ہے کہ بیچارے صاحب لوگ ہر طرح ناکام ثابت ہو کر وہاں کے ہر شعبۂ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ میم صاحبات براج رہی ہیں اگر خدانخواستہ ہندوستان میں بھی یہی صورت ہو جاتی کہ "اندرون خانہ" ایک دم سے "بیرون خانہ" اور "بیرون خانہ" ایک دم سے "اندرون خانہ" ہو کر رہ جاتے تو شاید یہاں کے لوگ ہندوستان کو حوا کی بیٹیوں کے لئے چھوڑ کر یا تو کسی ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں ابنِ آدم کی حکومت ہو یا خودکشی کر لیتے۔

اس لئے کہ یہ انقلاب ہندوستان کے مردوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہے کہ ان کی بیویاں تو کچہری عدالت کریں اور وہ خود گھرداری کریں۔ بچوں کو کھلائیں۔ یعنی مرد پیدا ہو کر عورت کے فرائض انجام دیں۔ تو جناب مطلب کہنے کا یہ کہ یورپ کی بیکاری پھر بھی قابلِ برداشت ہے کہ وہاں کے مرد بیکار ہو گئے اور عورتیں باکار ہو گئی ہیں ایک در بند ہوا اور دوسرا کھل بھی گیا۔ اور ہمارے ہندوستان شریف کے تو دونوں در اس طرح بند ہوئے ہیں کہ گویا کنجی ہی کھو گئی۔ لہذا اب کبھی کھلنے کی بھی اُمید نہیں ایسی صورت میں اگر ہندوستان کے لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ کہ بیکاری ہمارا مقصدِ حیات ہے تو بتایئے کیا غلط سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ بیکار جد وجہد کر کے اپنی جان دے دیں یا بے معنی کوششوں کے پیچھے مر جائیں آخر کیا کریں؟ اس بیکاری کا جو علاج ہے وہ ہندوستانیوں سے عمر بھر نہیں ہو سکتا اور اگر ہو سکتا ہے کر دیکھیں، ہم جبھی جانیں کہ یورپ کے مردوں کی سی غیرت اور حمیت پیدا کر کے دکھائیں اور اپنے آپ کو عورتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور اگر یہ نہیں ہو سکتا، تو آج سے بیکاری کا رونا چھوڑ دیں۔ جب یہ معلوم ہے کہ موجودہ دَور "دورالنساء" ہے تو پھر بیکاری دُور کرنے کی جد وجہد کرنا فطرت سے جنگ کرنا ہے یا نہیں؟

کیسی بیکاری اور کیسی کچھ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جس قدر بیکاری میں انسان کثیر المشاغل ہو جاتا ہے باکاری میں قطعاً نہیں ہو سکتا۔ بیکاری خود ایک ایسا مشغلہ ہے کہ انسان کو اس سے کبھی فرصت نہیں ملتی۔ یقین نہ آتا ہو تو کسی بیکار انسان کا صرف ایک ہفتہ کا پروگرام دیکھ لیجئے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کیا اتنا کام آپ زندگی بھر بھی کر سکتے ہیں؟ یقیناً اگر آپ کو آپ کی دگنی عمر بھی ملتی تو شاید آپ اس ایک ہفتہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً ایک شخص بیکار ہے اور اس کو کسی مشغلے کی فکر ہے۔ وہ سب سے پہلے ڈپٹی کلکٹری سے لے کر وکیسنیری تک کے لئے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ملازمت مل جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ارادہ ہے کہ آٹا پیسنے کی چکی لگا کر قسمت آزمائی کرے گا۔ اور اس سلسلے کا تمام حساب و کتاب مرتب ہو چکا ہے لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر حیدر آباد میں کوئی ملازمت مل گئی تو اس کو ترجیح دی جائے گی۔ ایک طرف یہ بھی دل چاہتا ہے کہ اگر سستی مل جائے تو ایک لاری خرید لی جائے، بڑے نفع کی چیز ہے لوگوں نے ایک لاری خرید کر اتنا نفع اُٹھایا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُن کے پاس دس لاریاں ہو گئیں اور وہ لکھ پتی بن گئے۔ لیکن اگر ریلوے اسٹیشن پر کتابوں کے فروخت کرنے کی اجازت مل جائے تو کیا کہنا ہے۔ دگنا اور چوگنا فائدہ ہے

اور یہ ہڈی کا کاروبار بھی بڑے نفع کی چیز ہے۔ بس انسان مستقل مزاج اور محنتی ہو پھر روپے کی کوئی کمی نہیں اور ان سب سے اچھا تو یہ ہے کہ ایک ماہوار ادبی رسالہ نکال لیا جائے اور اگر خدا توفیق دے تو روزانہ اخبار سے تو کوئی بہتر بات ہی نہیں۔ مختصر یہ کہ اس کے جتنے ارادے ہوتے ہیں سب اپنی اپنی جگہ مستقل اور اس کا ذہن ہر جگہ کام کرتا ہے یہ خیالی اسکیمیں جب عمل میں آجاتی ہیں اُس وقت کچھ نہ پوچھیئے کہ کیا حال ہوتا ہے وہی بیکار انسان بہ یک وقت ڈپٹی کلکٹر سے لے کر تمام ان عہدوں پر جن کے نام اس کو یاد ہیں ملازم ہوگا۔ پن چکی کا بلا شرکت غیرے مالک ہوگا۔ ریاست حیدرآباد میں اس طرح ملازم ہوگا کہ کہ عنقریب کوئی "یار جنگ" ہونے کی بھی اُمید ہوگی لاری بلکہ لاریوں کا مالک ہوگا ریلوے اسٹیشن کی ٹھیکیداری کا شرف بھی حاصل ہوگا۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں اس کے دماغ کی رسائی ہوئی ہوگی۔ بس وہ اپنے نزدیک وہاں تھوڑی دیر کے لئے عالمِ تخیل میں سہی بہرحال کامیاب ضرور ہو گیا ہوگا۔ اور اس فریب خیال نے اس بیچارے کی حالت اُس کتے کی سی بنادی ہوگی جو شیش محل میں ہر طرف اپنی صورت دیکھ کر باؤلا ہو جانے کے قریب ہو، یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ کم یا زیادہ دُنیا کے ہر بیروزگار میں پائی جاتی ہے مگر تعلیم یافتہ بیروزگار میں فرق

موجود ہے ۔ فرق یہ ہے کہ جو نا سمجھدار ہیں یعنی جن پہ بیکاری کا ہلکا سا حملہ ہوا ہے یا جنہوں نے اس حملہ کا کامیاب مقابلہ کیا ہے وہ تو خیر اس قسم کی تمام تجاویز اپنے ذہن میں رکھیں گے اور اُن کے یہاں تمام صلاح مشورہ بس دل اور دماغ کے درمیان ہوگا ۔ یعنی ان کی اسکیمیں اوّل تو کسی کو معلوم نہیں ہوں گی اور معلوم بھی ہوں گی تو مخصوص لوگوں کو لیکن وہ لوگ جو فطرتاً کمزور واقع ہوتے ہیں یا جن کو بیکاری نے ہر اعتبار سے ضعیف بنا دیا ہے ۔ اس معاملے میں اسی قسم کے انسان ثابت ہوں گے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی ان کے پاس جائیے تو السّلام علیکم وعلیکم السّلام کے بعد جو اس مخصوص مبحث پر گفتگو شروع ہوگی تو اس وقت تک سلسلہ جاری رہے گا ۔ جب تک آپ خود "اجازت ہے ؟" نہ کہیں اور پھر اس گفتگو میں جس بے ساختگی کے ساتھ متکلّم خود اور بےخود ہو جاتا ہے ۔ اس کا تعلق بس دیکھنے سے ہے ۔ اس وقت اگر آپ نے اس بیچارے کی گفتگو توجہ کے ساتھ سُن لی تو آپ کا یہ احسان وہ عمر بھر نہیں بھول سکتا ۔ بلکہ آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ واقعی یہ بیچارہ صرف میری وجہ سے اب تک زندہ ہے ورنہ نہیں معلوم کب کا اس خود غرض دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا ، آپ کی صورت دیکھتے ہی وہ فوراً آپ کی طرف بڑھے گا کہ "السلام علیکم ، بھائی عید کا چاند ہو گئے کہو کیسی طبیعت ہے اور بھاوج کا کیا حال

ہے؟" اگر اس کے جواب میں کہیں آپ نے اس کا حال بھی پوچھ لیا کہ "خدا کا شکر ہے بھائی۔ اچھا ہوں۔ گھر میں بھی خیریت ہے۔ تم اپنی کہو کہ اس درخواست کا کیا ہوا؟" بس اسی قدر کافی ہے۔ گویا آپ نے اجازت دے دی کہ ہاں سناؤ "داستانِ امیر حمزہ" بس اس نے کہنا شروع کیا:۔

"تم کو نہیں معلوم ہوا۔ لاحول ولا قوۃ، اماں اس نے تو بہت طول کھینچا، ہوا یہ کہ ڈپٹی صاحب نے اس کو کمشنر صاحب کے پاس بھیج دیا اور کمشنر صاحب نے لکھ دیا کہ جو چاہو کرو، ہم نہیں جانتے۔ اب ڈپٹی صاحب کی پھونک نکل گئی کہ کہیں کمشنر صاحب نے غصے میں تو نہیں لکھا۔ میں جب گیا تو کہنے لگے ڈپٹی صاحب کہ کمشنر صاحب نے نامنظور کر دی، میں نے اپنے دل میں کہا یہ ہو کیوں کر سکتا تھا۔ جب یہ کمشنر صاحب بریلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے تو میں نے ان کو بڑے دن کا کارڈ بھیجا تھا، وہ مجھ کو جانتے ہیں۔ خیر بھائی تو میں چپ ہو رہا اور میں نے دہی ٹھیکہ والی کوشش شروع کر دی۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ دکان کی فکر بھی کرتے رہو۔ تو بھائی میں اس طرف سے بھی غافل نہیں۔ اب جو کچھ بھی خدا کر دے مگر آپ کی دعا سے اُمید ہے کہ سب کچھ ہو جائے گا، دکان امین آباد میں ہے جس میں چار در ہیں۔ مگر وہ جن کے پاس ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ میری ذاتی ہے۔ میں

اس کو خالی نہ کروں گا۔ یہ بڑی مشکل ہے اگر کہیں وہ اس کی ذاتی نہ ہوتی تو لیس مار لیا تھا۔ مگر اب کیا ہو؟ اور خوب یاد آیا۔ یار وہ دواؤں والی ترکیب تو ایسی لاجواب ہے کہ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔ بس تمام ہندوستان کے اخباروں میں اشتہار چھپوا دینا ہیں۔ پھر کیا ہے۔ جب فرمائش آئی"۔ لیا کوئلہ اور دیوار کا پلاسٹر اور دونوں کو ملا کر پیس لیا۔ بس دوا تیار ہے تو یار ایک دن بیٹھ کر اشتہار بنا ڈالو۔ مگر تم تو ملتے ہی نہیں اور وہ سنگر کمپنی کی ایجنسی بھی یوں ہی رہ گئی۔ تم اپنے وعدوں کو بالکل یاد نہیں رکھتے۔ اچھا تو کل کی رہی۔ ضرور دیکھو، فرق نہ ہو"

یہ تمام تجاویز تھیں جن کی تحریک یا تائید میں آپ شریک تھے یا جن کا آپ سے کوئی تعلق تھا۔ ورنہ اُن حضرت کے ذہن میں تو نہیں معلوم کتنی تجاویز ایسی بھی ہوں گی جن سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن آپ کی طرح کے دوسرے ہمدردوں کو دلچسپی ہے۔ مثلاً کسی نے تو یہ رائے دی ہو گی کہ ایک ہوٹل کھول لو۔ اب اس شخص سے جو گفتگو ہو گی وہ تمام تر ہوٹل کے متعلق ہو گی۔ کسی دوسرے شخص نے واشنگ کمپنی کھولنے کی صلاح دی ہے تو اس سے واشنگ کمپنی کے متعلق تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کہ دھوبیوں کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔

کتنے دھوبی کافی ہوں گے۔ کم از کم تین الماریاں دو بڑی میزیں ایک آفس ٹیبل وغیرہ کی ضرورت ہو گی اور پھر کپڑا دھونے کی جگہ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ وہاں پانی کی فراوانی بھی ہو اور وہ جگہ دکان سے قریب بھی ہو۔ مختصر یہ کہ تمام نشیب و فراز صرف ایک تجویز سے تعلق رکھتے ہیں اور اس تجویز کا تعلق بھی صرف ایک کرم فرما سے ہے۔ اسی طرح جتنے ہمدرد پیدا کئے ہیں۔ اسی قدر مختلف تجاویز بھی ہیں لیکن ان حضرت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کی ہمدردی قبول اور ہر کام کو شروع کرنے کے لئے اس طرح آمادہ کہ بس گویا کل ہی سے شروع بھی ہو جائیگا اگر آپ کو اپنی بتائی ہوئی ترکیبوں کے علاوہ ان تمام تجاویز کا علم ہو جائے جو آپ کے بے روزگار دوست کے ذہن میں ہیں تو آپ کو تعجب ہو گا کہ یہ شخص ایسا دماغ رکھتا ہے جو خزانہ ہے تجاویز کا اور ہر تجویز کے ساتھ ایسی مکمل معلومات اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ کہ وہ زندہ "انسائیکلو پیڈیا" بن کر رہ گیا ہے اور یہ سب اسی بیکاری کے طفیل میں ہوا ہے جس سے وہ کسی نہ کسی طرح چھوٹنا چاہتا ہے۔

یہ جو آپ کثیر التعداد ادبی رسالے دیکھ رہے ہیں اور جو بیشمار نکل آئے گویا کہ مٹی کے پو کی طرح کے انشا پردانہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کے متعلق

اگر آپ تحقیقات کریں گے تو ان کے عالم وجود میں آنے کا سبب زیادہ تر یہی بیکاری ہوئی ہوگی۔ انہوں نے بیکار ہونے کے بعد یہ سوچا کہ کچھ کرنا چاہیئے اور کسی نے ان کو رائے دی کہ ادیب بن جاؤ، مضمون لکھا کرو بس انہوں نے لکھنا شروع کر دیا، اور ان ہی کی ترکیب سے پیدا ہونے والے رسالوں نے ان مضامین کو شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز" کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرت جن کو حقیقتاً ادب سے کوئی تعلق نہ تھا ادیب بن گئے اور وہ رسالہ جو نہیں معلوم کیا تھا، علمی، ادبی رسالہ بن گیا۔ اب کر لیجئے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ ؎

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

کہہ کر اپنی "شوکت تھانویت" سے مستعفی ہو جائیں۔ لیکن وہ لوگ تو آپ کی وجہ سے مضامین لکھنا چھوڑ نہیں سکتے۔ جنہوں نے اپنی بیکاری کا علاج اسی کو سمجھا ہے اور جو اپنا پہاڑ کی طرح نہ کٹنے والا وقت مضمون لکھ کر کاٹتے ہیں، ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ اگر ہم غیرت دار ہیں اور وہ حضرات مستغنی مزاج، لیکن اگر اسی کے ساتھ "ایڈیٹر صاحبان رسالہ جات" کی قدر شناسیاں بھی باقی ہیں تو ہم واقعی ایک ایسا اعلان کرنے کے بعد

غائب ہو جائیں گے کہ سب سچے دل سے کم از کم ایک مرتبہ یہ کہہ دیں کہ۔ ۶۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تغیر کرنے والے ہیں

لحاف اندر لحاف

ہائے بیچارے مولوی عبدالصمد ! ع -

انہیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

جوانی کے چند ہی ثبوت دیئے تھے کہ سیدی و مولائی حضرت شاہ عبدالاحد کا دعمال ہو گیا اور آپ کو ان کی جگہ سجادہ نشین ہونا پڑا - جوانی کی تمام اُمنگیں داڑھی کی شکل میں لہلہا کر رہ گئیں - مگر جس نے بھی کہا ہے سچ کہا ہے ——— مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے - سجادہ نشین ہوتے ہی کشف و کرامات کے چشمے پھوٹ نکلے - ہر مجاز آپ کے لئے حقیقت بن کر رہ گیا - محفلِ سماع میں جس وقت آپ پر کیفیت طاری

ہوتی تھی، کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی نئے نویلے صوفی ہیں۔ بڑے شاہ صاحب قبلہ کے تمام مرید اس قالب میں بھی اپنے پیر ہی کا جلوہ دیکھ رہے تھے۔ اس لئے کہ ان کا سرِ نیاز تو ایک آستانے کا عادی ہو ہی چکا تھا وہ باپ بیٹے میں امتیاز کر کے اپنے اعتقاد کو کیونکر ڈگمگاتے۔

والد صاحب مرحوم بڑے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ موجودہ شاہ صاحب اس خاکسار کے بچپن کے دوست ہونے کے علاوہ جوانی کے کچھ ایسے ساتھی تھے کہ اکثر چاندنی راتوں میں ہم دونوں ساتھ ساتھ ڈوب چکے تھے غالباً یہی وجہ تھی کہ جب یہ موجودہ حضرت صاحب تجدیدِ بیعت کے لئے ہمارے یہاں تشریف لائے تھے، بجائے اعتقاد پیدا ہونے کے رہ رہ کر وہ مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے جن میں گاؤ تکیہ کے سہارے رکھا ہوا تقدس کا یہی تو وہ ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح عرس کے ہنگامے میں کچھ ایسی چوریاں کرتا پھرتا تھا جیسی چوریاں گوپیوں کے سلسلہ میں کرشن جی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اور ان تمام چوریوں میں ہم گویا چور کے بھائی گرہ کٹ، ایک مرتبہ تو صاحب کچھ نہ پوچھیے قیامت آگئی تھی۔ ہمارے حضرت صاحب نے ستارہ سے کہدیا تھا کہ میں کھائے لیتا ہوں زہر اور وہ بھی ایسی نامراد کہ اس نے صاف کہدیا کہ میری جوتی کی نوک سے۔ بچاس دفعہ تم زہر کھالو۔ مجھ سے کہا چنانچہ زہر کا انتظام بھی تقریباً ہو گیا تھا

کہ ہم لوگوں نے آپ کو ایک اور ہی ترکیب سمجھا دی کہ ستارہ کے لئے جان دینے کے بجائے اس سے انتقام کیوں نہ لیا جائے، ستارہ اور نرگس کی رقابت مشہور تھی لہذا یہ طے پایا کہ نرگس کی طرف متوجہ ہو کر ستارہ کو خوب جلایا جائے، خدا کا شکر ہے کہ حضرت صاحب کی سمجھ میں یہ بات آگئی ورنہ آج یہ گدّی ہی ویران ہوتی۔

اب ایک طرف تو یہ مناظر تھے دوسری طرف حضرت صاحب زہد و تقدّس کے ایک کوہِ گراں کی طرح مریدوں کے حلقہ میں گردن جھکائے رونق افروز ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ نرگس کے متعلق معلوم تو کریں کہ کہاں ہے آجکل مگر کسی طرح ہمت نہ ہوتی تھی۔ تخلیہ میں باریاب ہوئے تو بھی شرارت سے ناچنے والی آنکھوں کو نشۂ وحدت میں مخمور پایا۔ شرف ہمکلامی عطا کیا تو وہ بھی کچھ اس قسم کا:۔

"بھائی میرے۔ دنیا سے آخر کب تک کھیلو گے۔ اب کچھ عاقبت کی بھی فکر کر لو۔ یہ ایک وظیفہ ہے نمازِ عشاء کے بعد چالیس مرتبہ پڑھ لیا کرو انشاء اللہ سکونِ قلب حاصل ہوگا۔"

مگر ایک دن حضرت صاحب کتابوں کی الماری کھولے بیٹھے تھے اور ہاتھ میں "چوٹیں"، عصمت چغتائی کے مضامین کا مجموعہ۔ ہم دیکھ کر سن سے رہ گئے آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا کہ اگر خدانخواستہ حضرت صاحب نے اس کا ایک آدھ مضمون پڑھ لیا ہے

تواب بڑی طرح خبر لی جائیگی چنانچہ وہی ہوا۔ ہم کو دیکھتے ہی بدلے ہوئے تیور دں سے
قریب بلا کہ فرمایا :-

" یہ کیا ہے ——— ؟ "

" چوٹی "

" وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر کیا اس قسم کی کتابیں تمہارے کتب خانہ میں ہوتی ہیں۔
اور یہ لکھنے والی کیا واقعی عورت ہے۔ یا کوئی مرد عورت بن گیا ہے "

یا اللہ اب ان حضرت کو کیسے سمجھایا جائے کہ ادب کیلئے جنس کی کوئی قید نہیں لکھنے والی
اگر مرد ہوتی تو بھی وہ یہی لکھتی جو اس نے عورت ہو کر لکھا ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے
لکھا ہے جو عورت یا مرد بن کر نہیں بلکہ صرف آدمی بن کر اس کو پڑھیں مگر مصیبت تو
یہ ہے کہ آدمی بھی اس دنیا میں مرد کو کہتے ہیں ؟ اور عورت آدمی کب ہوتی ہے وہ تو
بس عورت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ جو صاحب پوچھ رہے ہیں وہ تو آدمی بھی نہیں کچھ اس سے
بھی اونچی چیز ہیں۔ ؎

ماورائے عالمِ ہستی ہیں ان کے واردات
شیخ جی کو اصطلاحاً آدمی کہہ لیجئے

مگر یاد آ گیا کہ حضرت صاحب اب نہ سہی مگر کبھی آدمی رہ چکے ہیں اور اس وقت

خود ادیب نہ سہی مگر ادب سے ذوق ضرور رکھتے تھے لہذا طے کیا کہ لاؤ بھینس کے آگے ذرا بین بجا کر دیکھیں۔

"آپ نے عصمت چغتائی کا نام تو سُنا ہو گا"

نہایت بیزاری سے فرمایا: "بحمد اللہ کہ میں نے کبھی نہیں سُنا۔ مگر یہ ہے کیا خرافات"

عرض کیا "چند نقوش ہیں"

آواز میں کرختگی کے ساتھ فرمایا: "نقوش —؟ واہیات۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی انتہا ہے پھر یہ کہ لکھنے والی عورت ———"

گویا اگر مرد لکھتا تو حضرت کو اعتراض نہ ہوتا۔ اعتراض تو صرف یہ ہے کہ فن عورت کے ہاتھ میں کیونکر پہنچ گیا۔ بلکہ فن بھی نہیں فن کا کیا ذکر اگر وہ اس کو فن ہی سمجھ لیتے تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ سوچا کہ لاؤ یہی بحث چھیڑ دیں:۔

"اس نے عورت کی حیثیت سے نہیں فنکار کی حیثیت سے زندگی کے کچھ خطوط واضح کئے ہیں"

تحقیر سے ارشاد فرمایا: "فنکار۔ استغفر اللہ ——— یہ فن ہے؟ تم لوگ مذہب سے دور ہو کر شیطان کے اتنے قریب آگئے ہو کہ ان لغویات کو فن کہنے لگے ہو"

گویا شیطان اتنا بڑا فن کار ہے جس کے قریب پہنچتے پہنچتے لغویت بھی فن بن جاتی ہے۔

عرض کیا: "اس میں ایک مطالعہ ہے لحاف۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا"

حضرت نے کتاب میں گرد پوش کی نشانی لگاتے ہوئے فرمایا "توبہ توبہ کس قدر مخرب اخلاق گندی اور نامعقول چیز ہے۔ میری نظر اسی پہ پڑ گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس قسم کی کتابوں کا شرفائے گھر میں ہونا ہی تعجب کی بات ہے مجھے تو سخت افسوس ہے کہ تمہارے مطالعہ میں گویا یہ ناپاک چیزیں رہتی ہیں۔" حضرت صاحب غصہ میں پھول پھال کر قریب قریب بھینس بن گئے تھے اور یہ نہایت مناسب موقع تھا کہ ہم بین بجانا شروع کر دیں لہذا عرض کیا: "اس کتاب میں مجھ کو سوائے اس کے کچھ نظر آیا نہیں کہ اس میں ایک نباض نے چند امراض کے تشخیصی کمالات پیش کئے ہیں۔ اب یہ تو مرض کا قصور ہے کہ وہ گندہ کیوں ہے۔ شرمناک کیوں ہے۔ مرض کی تشخیص تو کوئی جرم نہیں بلکہ ایسی کامیاب تشخیص تو مبارکباد کی مستحق ہونا چاہیئے اس لئے کہ اسی کے بعد مرض کے سدباب کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔"

جلبلا کر ارشاد فرمایا "خدا جانے کیا بک رہے ہو۔ بھلا غضب خدا کا یہ باتیں لکھنے والی ہوتی ہیں۔"

عرض کیا "اگر ہونے والی ہوتی ہیں تو لکھنے والی کیوں نہیں ہوتیں۔ نہ ہونا چاہیئے مگر ہوتی ہیں تو گویا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ ہونے دیا جائے۔ جرم کو چھپا چھپا کر اخفائے جرم

کا جرم جس تسلسل کے ساتھ اب تک چلا آیا ہے اب بھی جاری رہے گا۔ ذرا ان لکھنے والوں کی جرأت دیکھئے کہ انھوں نے کس بہادری کے ساتھ دُنیا کی لعنتوں کا اپنے کو نشانہ بنا کر یہ کام شروع کیا ہے۔ وہ ایک ماہر جرّاح کی طرح مریض کی چیخ پکار سُن رہے ہیں مگر ان کے اُس ہاتھ میں لرزش نہیں جس میں نشتر ہے وہ نہایت سکون کے ساتھ آپریشن کر رہے ہیں تاکہ فاسد مادّہ نکل جائے اور صحت کا امکان پیدا ہو سکے۔"

حضرت تو خیر کیا سمجھتے مگر ہم کو یہ اطمینان ہوتا جا رہا تھا کہ ہم ان کے تقدس سے مرعوب ہو کر جھوٹ نہیں بول رہے ہیں اور اگر انسان یہ طے کر لے کہ وہ سچ بول کر رہے گا تو وہ یہ باتیں کرتا کیا معنی لحاف تک لکھ کر مقدمہ چلوا سکتا ہے۔ حضرت نے پھر ڈانٹا۔ "یہ سب شیطانی استدلال ہیں۔ یہ شرمناک باتیں لکھنا اور پڑھنا دونوں یکساں قسم کے عیب ہیں۔ جس طرح مزے لے لے کر یہ چیزیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح بہت سی مفید باتیں لکھی جا سکتی تھیں۔"

عرض کیا۔ "مفید باتیں تو خیر یہ بھی ہیں رہ گیا وہ مزہ جو آپ نے ان میں محسوس کیا وہ دراصل ان میں نہیں ہے بلکہ ان کے پڑھنے والے میں ہوتا ہے۔ لکھنے والے نے تو ان کو اس طرح لکھا ہے جیسے کسی ڈاکٹر کو کسی ایسے حصۂ جسم کا علاج کرنا پڑے جس میں کچھ جنسی کشش بھی ہو مگر ڈاکٹر کی توجہ اس کشش کی طرف نہیں ہو سکتی کہ وہ صرف مرض کی طرف

متوجہ رہے گا اس کے ہاتھ اس حصّہ کو چھوئیں گے بھی ٹٹولیں گے بھی اور دبائیں گے بھی مگر وہ ہر حال میں اس کو جسم کا مریض حصّہ سمجھتا رہے گا اُس کے نزدیک اس حصّہ میں کوئی کشش اس لئے نہیں ہو سکتی کہ وہ تو اس حصّہ کے مرض کی حقیقت کو سمجھ چکا ہے، اگر کسی طبّی کتاب میں کوئی برہنہ تصویر چھاپ دی جائے تو اس تصویر کو آپ مخربِ اخلاق کیوں نہیں کہتے۔ اگر وہ تصویر مخربِ اخلاق نہیں ہے تو یہ تصاویر کیوں مخربِ اخلاق سمجھی جا رہی ہیں جبکہ ان کا مقصد بھی وہی ہے ——"

حضرت صاحب نے جِزبز ہو کر فرمایا "اچھا صاحب۔ اچھا۔ میں آپ کو سمجھا چکا اور آپ سمجھ چکے —— "

گستاخی تو تھی مگر قطعِ کلام کر کے عرض کیا "جی نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ اس گفتگو کی روشنی میں اب آپ ایک مرتبہ اس کتاب کے کسی مضمون کو پڑھ کر اندازہ فرمائیے کہ یہ برہنہ تصاویر کا کوئی البم ہے یا علمِ تشریح کا کوئی مرقع ——"

حضرت صاحب نے غصّہ سے کتاب ایک طرف اچھالتے ہوئے فرمایا "میری دنیا آپ کی اس دنیا سے قطعاً مختلف ہے ——"

نوبہار اسی وقت چائے لیکر آ گئی ورنہ حضرت صاحب بیحد خفا ہوتے۔ حضرت صاحب کی اور ہماری نظر ایک ساتھ نوبہار کی طرف اٹھی جس کے کُرتے کا گریبان کھلا ہوا تھا۔ آ

جو حضرت صاحب کی طرف نظر گئی تو اب تک نو بہار میں گم تھے۔ غالباً عصمت چغتائی کے افسانے والا ئل نو بہار کے کھلے ہوئے گریبان میں ڈھونڈھ رہے ہوں گے۔ ہم کو بھی چونکہ اسی وقت میٹنگ میں جانا تھا لہٰذا حضرت صاحب سے اجازت لیکر رخصت ہو گئے۔ اب خدا جانے وہ تِل حضرت صاحب کو ملا یا تِل کی اوٹ میں پہاڑ دستیاب ہو گئے بہر حال سہ پہر کے بعد جب واپسی ہوئی تو نو بہار سے معلوم ہوا کہ حضرت صاحب آج کسی سے ملے بھی نہیں کچھ طبیعت ناساز ہے دن بھر لیٹے رہے ہیں۔ گھر میں عورتوں کو بیحد تشویش تھی کہ خدا جانے حضرت صاحب کا مزاج کیسا ہے۔ باہر مرید آتے تھے اور پہرہ پر بیٹھا ہوا ملازم ان کو دروازے ہی سے رخصت کر دیتا تھا۔ ارادہ کیا کہ مزاج پرسی کے لئے جائیں کہ آپا نے آکر گھیر لیا: "بھیا۔ کیا طے کیا آخر بیعت کے لئے۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئیگا۔ کنواں خود پیاسے کے پاس آیا ہے۔"

ٹالنے کے لئے کیا کہتے کہدیا جلدی میں "بھئی اتنی جلدی تو میں اتنے گناہ نہیں کر سکتا کچھ تو وقت دیجئے آپ لوگ۔"

حیرت سے بولیں "گناہ؟ کیا مطلب۔"

عرض کیا "بات یہ ہے نا کہ مرید ہونے کے بعد پھر تھوڑی کچھ کر سکوں گا جو کچھ کرنا ہیں گناہ پہلے سے کر لیں پھر ہم کہاں اور یہ رنگینیاں کہاں۔ نفرت ہو کے رہ جائیگی

دنیا سے "

ہنس کر بولیں "چلو ہٹو۔ آج میں منگواتی ہوں مٹھائی۔ بس آج کا دن اچھا ہے۔ رات ابا کو بھی خواب میں دیکھا ہے کہ جیسے تمہارے سر پہ وہ دستار باندھ رہے ہیں جو سبز رنگ کی بڑے حضرت صاحب نے ان کو دی تھی "

ہم نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر۔ ابھی سے اس سفرِ آخرت کو دل نہیں چاہتا۔ سچ بتاؤ آپا ابھی ہم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے کہ دُنیا سے مُنہ موڑ کر بیٹھ رہیں "

آپا نے ہنس کر کہا "اچھا خیر یہ باتیں بنانے کو رہنے دو تم چلو باہر میں مٹھائی منگوا کر بھیجتی ہوں۔"

جو مرید ہونے ہی کا قائل نہ ہو وہ مرید ہو جانے میں کیا مضائقہ سمجھ سکتا ہے۔ پھر یہ کہ "تازہ تازہ گلاب جامنیں اور امرتیاں الگ سے موجود۔ مگر خدا کرے حضرت صاحب کی طبیعت اچھی ہو سُنا ہے کہ دن بھر لیٹے رہے۔

دبے پاؤں کمرے کے دروازے کے پاس جا کر شیشے سے جو جھانکتے ہیں تو حضرت صاحب لحاف میں دراز تھے۔ ایک ہاتھ لحاف کے اندر تھا۔ دوسرے ہاتھ میں وہی نامراد کتاب "چوٹیں" اور لحاف کا صفحہ کھلا ہوا۔

اطلاعاً کھنکھار کہ جو کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو کتاب والا ہاتھ غڑاپ سے لحاف کے اندر
اور لحاف کے اندر والا ہاتھ جھپاک سے لحاف کے باہر۔

اب مرید ہو جانے میں آخر کیا ہرج تھا۔

کاش نرگس کمبخت کا پتہ چل سکتا کہ کہاں ہے۔ ہو جاتی وہ بھی مرید۔ خیر فی الحال
نو بہار سہی۔

جی ہاں پڑے ہیں

عاشقی میں تو خیر عزتِ سادات تک چلی جاتی ہے اور اس طرح کہ گویا بات ہی نہیں لیکن اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ مزاح نگاری میں بھی ناک کا جھڑ سے صاف ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ رہے گی اور واقعی جب خود مزاح نگار اپنی برادری کی عزّت و آبرو کے درپے ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ مزاح نگاروں کی آبرو ریزی ہوتے ہوئے کیا دیر لگے گی چنانچہ ملاحظہ فرمایئے کہ خود مزاح نگاروں کی برادری کے ایک رکن برادرم مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی المتخلص بہ کوں تارکو جو مارواڑ میں بیٹھے بٹھلائے دل لگی سوجھی تو کلکتہ کے ظریف اخبار چونچ میں یہ تجویز پیش فرما دی کہ ہندوستان کے تمام مزاح نگار

خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس سوال کا جواب بصورت مضمون دیں کہ کیا وہ "کبھی پٹے ہیں؟"
اور پھر لطف یہ کہ جواب میں بچپن یا طالب علمی کے زمانہ کی پٹائی سے کوئی بحث نہ
کی جائے بلکہ وہ پٹائی جو بچپن اور طالب علمی کے بعد یعنی باعزت اور باحیثیت ہو کر
اپنی حماقت یا دوسروں کی زیادتی کی بدولت ہوئی ہو۔ اب بتائیے۔ کہ یہ بات تمام
عزت و آبرو پر پانی پھیر دینے والی ہے یا نہیں؟ اگر ہم جھوٹ بول کر بچنا بھی چاہیں
کہ بھائی یہ اتفاق کبھی ہم کو پیش نہیں آیا تو اس کے واسطے بھی اس ظالم چغتائی نے
پیش بندی کر دی ہے کہ "اگر ان حضرات میں سے کسی صاحب نے اس وجہ سے انکار کر دیا
کہ میں کبھی نہیں پٹا تو بخدا مجھے تو یقین آئیگا نہیں"۔ ایسی صورت میں سوائے صاف
صاف عرض کر دینے کے اور کیا چارہ ہے؟

الوداع اے عزت و آبرو، الفراق اے خاندان بھر کی ناک۔ اگر آپ ایمان کی بات
پوچھتے ہیں تو جی ہاں پٹے ہیں اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ بارہا پٹے ہیں مگر اس طرح کہ ہم
نے بھی پیٹا ہے اور اس پیٹنے کے جواب میں۔ ؎

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

خود بھی مار کھائی ہے اور ہماری بھی مرمت ہوئی ہے لیکن چونکہ اس مضمون میں ہم کو
اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ ہم محض اپنے پٹنے کی داستان سنائیں تاہم اس مضمون کے

پڑھنے والوں کو اپنی اپنی جگہ یہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں جب لکھنؤ کی فضائیں "گو بیک سائمن، سائمن گو بیک" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھیں اور سیاہ جھنڈیوں سے کمیشن کا استقبال کرنے والوں کے علاوہ بہت سے تماشائیوں کا بھی چار باغ اسٹیشن کے قریب میلہ لگا ہوا تھا۔ ہم کو بھی روزنامہ ہمدم مرحوم کے دفتر سے اٹھا کر اس محشرستان میں بھیج دیا گیا کہ تمام واقعات کی عینی شہادت حاصل کریں اور ہم دفتر سے اٹھ کر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس "انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر" میں ایک قطرہ کی طرح شامل ہو گئے۔ سیاہ جھنڈیوں سے فضائیں تاریک ہو رہی تھیں اور "گو بیک" کے نعروں سے زمین اور آسمان ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے ایک طرف تو مجمع کا یہ عالم تھا دوسری طرف پولیس کے لال پگڑی والے پیدل اور سوار مجمع کو آگے بڑھنے کی کوشش سے روکنے بلکہ پیچھے ہٹانے کی جد و جہد میں مصروف نظر آرہے تھے۔ بہر حال اسی مواج سمندر میں ہم بھی تھپیڑے کھا رہے تھے کہ ایک دم سے خدا جانے کمیشن آگیا یا قیامت آگئی لیکن ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ پولیس والے مجمع پر جھپٹے اور مجمع سے بہت سے لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے اس طوفان کی وجہ دریافت کرنے کا ہوش کسے تھا۔ ہم

بھی بلا وجہ سر پہ پیر رکھ کر بھاگے مگر بھاگتے کدھر ہر طرف تو انسان ہی انسان تھے۔ جو بھاگنے تک کی جگہ نہ دیتے تھے۔ بہر حال کسی پہ گرے کسی کو اپنے اُوپر گرایا اور کسی نہ کسی طرح مجمع سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک حد تک بد حواسی کے ساتھ ہم کوشش کرنے لگے۔ لیکن اُدھر سے پنڈت جواہر لال نہرو ڈٹے رہنے پہ زور دے رہے تھے اور بہت سے بھاگنے والے اس نازک وقت میں بھی ان کی آواز سننے کا ہوش رکھتے تھے۔ لیکن ہم نے تو طے کر لیا تھا کہ کوئی بھی کچھ کہے مگر بندہ اب یہاں ٹکنے والا نہیں ہے۔ لیکن جناب قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ ہم بھاگ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایک ڈنڈا ہمارے رسید کیا جو اتفاق سے ہمارے بھاگتے ہوئے پیروں میں سے ایک پر پڑا اور سچ پوچھئے تو خدا نے بڑا فضل کیا ہم بال بال بچ گئے۔ اب ہم ایک درخت کے قریب پہنچکر ذرا اپنے پیر سہلا رہے تھے کہ ایک گھوڑے سوار لال پگڑی والے نے کچھ ہماری شان میں گستاخانہ الفاظ کہنے کے بعد اس زور سے بلّم رسید کیا کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ اور اپنے شہید ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد مطمئن ہو گئے لیکن آنکھ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بلّم درخت پہ اس طرح پڑا تھا کہ ہم صاف بچ گئے تھے۔ لیکن جناب اس حادثہ کے بعد جو ہم بھاگے ہیں تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے اور دفتر میں آکر

دم لیا۔

غالباً ہمارے پٹنے کا یہ واقعہ تو قومی نقطۂ نظر سے بجائے باعثِ شرم ہونے کے باعثِ فخر ہے بلکہ اگر درخت کے حائل نہ ہو جانے سے وہ بلّم ہم پر پڑتا تو آج ہم کو بھی وہی درجہ حاصل ہوتا جو لاجپت رائے آنجہانی کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد واقعات قومی اور غیر قومی ہر نقطۂ نظر سے شرافت پر پانی پھیر دینے والے ہیں مگر مجبوری ہے کیا کیا جائے لہٰذا سنیئے اور ہماری نجابت کی داد دیجئے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست سے اسی قسم کے معاصرانہ تبادلہ کی نوبت آ گئی، اُن دوست کا نام بتانے میں ذرا ہماری توہین ہوتی ہے۔ بہر حال خود واقعہ بھی کچھ کم نہیں ہے اور مطلب تو صرف یہ بیان کرنے سے ہے کہ ہم کیونکر پٹے۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ ہمارے وہ کرمفرما ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر بہت سے ایسے واقعات دہرانا شروع کر دیتے تھے جو ہماری دکھتی ہوئی رگ والے واقعات ہوتے تھے۔ لیکن اس بندۂ خدا کو خدا معلوم اس میں کیا لطف آتا تھا کہ لڑائی تو ہوئی آم کے سلسلے میں اور دکھڑا رونا شروع کیا انہوں نے اِملی کا۔ چنانچہ جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح رونما ہوا کہ وہ اپنے چند دوستوں کے سامنے قابلیت بگھار رہے تھے۔ ہم بھی جا پہنچے اور لگے اُن کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑنے اس وقت

تو خیر وہ اس طرح خاموش رہے کہ چہرہ پہ ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا لیکن جب ان کے دوست اٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے اپنی برہمی کا اظہار شروع کر دیا اور ہمارے اس سوال پر کہ کیوں چپ کیوں ہو؟" وہ برس پڑے کہ :-

"میں آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اگر آپ کی سنجیدگی کا یہی حال ہے کہ آپ کو آئے گئے لوگوں کا بھی خیال نہیں تو آپ مہربانی فرما کر مجھ کو معاف رکھیں۔ خود آپ کی تو خیر کوئی پوزیشن ہے ہی نہیں لیکن آپ کو دوسرے کی پوزیشن کا بھی خیال نہیں ہے تو جناب میں باز آیا"

اب بتائیے ان حضرت کے یہ الفاظ کس قدر مشتعل کرنے والے تھے۔ لیکن چونکہ غلطی خود ہماری تھی لہذا ہم نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا :-

جناب والا مجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کی طبع نازک کو میرا مذاق اس قدر گراں گزرے گا اگر آپ نہیں ملنا چاہتے تو بسم اللہ"

وہ "آپ نے آج ہی یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہے بلکہ اب تو یہ آپ کی عادت ہوتی جاتی ہے اور اگر یہی حال ہے تو انشاء اللہ میں کیا کوئی بھی منہ لگانا پسند نہ کرے گا"

میں "بندہ نواز معاف فرمایئے گا۔ آپ کی طرح کوئی اور خر دماغ نہیں ہے وہ گئے

آپ تو ہیں نے خود کان پکڑے کہ اب کبھی نہ ملوں گا۔"

وہ:۔ "اب آپ کھلواتے ہیں تو سنیئے کہ آپ کے تمام دوست جن سے ذرا بھی سنجیدگی چھو گئی ہے آپ سے نالاں ہیں۔ اور کوئی آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور واقعی اس لونڈے پن کو کہاں تک برداشت کرے۔"

میں:۔ "میرا لونڈا پن آپ کی خر دماغی سے پھر بھی اچھا ہے اور معلوم نہیں آپ کو کس بات پر اتنا ناز ہے۔ اگر کچھ ہوتے تو خدا جانے کیا کرتے کچھ نہ ہونے پر تو یہ حال ہے۔"

وہ:۔ "میں اس قسم کی بدتمیزی کی گفتگو سننا نہیں چاہتا۔"

میں:۔ "میں آپ کے ایسے بدتمیزوں سے گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتا۔"

وہ:۔ "آپ اپنی زبان کو روکئے ورنہ اس گستاخی کی سزا کو پہنچیے گا۔"

میں:۔ "اپنے حواس میں رہو۔ حد سے نہ بڑھو۔ ورنہ یہ تمام اکڑ دھری رہ جائے گی۔"

وہ:۔ (گلا پھاڑ کر) "خاموش ——— بدتمیز کہیں کا۔"

میں:۔ (گلا پھاڑ کر) "چپ ——— بیہودہ ——— بدتمیز کہیں کا ———

وہ۔ تم خود بدتمیز۔"

اس کے بعد پہلے وہ کرسی سے کھڑے ہوئے اور ان کے بعد ہم۔ سب سے پہلے تو بنچ میں رکھا ہوا حقہ گرا اس کے بعد ہم اور وہ گتھم گتھا ہو گئے ہم کو یہ معلوم تھا کہ ہم کمزور ہیں۔ دبلے پتلے ہیں اور وہ ہاتھ پیر کے اچھے تھے۔ لیکن غصہ اشتعال، اشتعال اور غصہ یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ چنانچہ ہم نے میز سے کرسی اور کرسی سے آرام کرسی پر گرنا شروع کیا۔ لیکن ہر مرتبہ گرنے کے بعد اس جوش کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ اب کی یا تو ہم نہیں یا وہ مردود نہیں۔ لیکن سچ ہے کہ کمزوری مار کھانے کی نشانی ہوتی ہے۔ چنانچہ آخر میں انہوں نے ہم کو مسہری پر گرا کر ایک آدھ ایسا گھونسہ رسید کیا کہ ہم کو جوابی گھونسے کا ہوش نہیں رہا اور ہم نے ان کے گھٹنے سے دبے ہوئے سینہ سے بمشکل آواز نکال کر کہا۔

"یہ شرافت ہے، کمینہ پن، شہد پن، بدمعاشی"

اور اس کے بعد انہوں نے جب ہم کو چھوڑا۔ تو ہم مقابلہ پر نہیں آئے بلکہ نہایت جوش کے ساتھ تنتناتے ہوئے ان کے کمرہ سے نکل گئے اور اس واقعہ کے دو مہینے بعد تک ہم دونوں آپس میں نہیں ملے۔ لیکن یہ واقعہ آج ہمارے قلم سے نکلا ہے ورنہ اسی دن جب گھر میں سب نے پھٹے ہوئے کپڑے اور چوٹیں دیکھیں اور سبب پوچھا تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ ایک پاگل کتا لپٹ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ

ہم گھسے بھی اور اس نے ہمارے کپڑے بھی نوچے لیکن اس کا دانت کہیں نہیں لگا۔ مگر آج یہ راز کی بات ہماری زبان سے نہ سہی۔ بہرحال ہمارے قلم سے نکل رہی ہے اب چاہے ہم کو کوئی ذلیل سمجھے یا کمینہ!"

ایک مرتبہ ریل میں ہماری شامت آئی اور وہ اس طرح کہ ہم غالباً لکھنؤ سے بھوپال جارہے تھے چنانچہ صبح کے وقت جب لکھنؤ جھانسی ایکسپریس سے اتر کر دہلی بمبئی ایکسپریس پر بیٹھے تو بڑی کش مکش تھی اول تو تیسرے درجہ میں ہمیشہ کش مکش ہوتی ہے لیکن اس دن کچھ خلافِ معمول کش مکش زیادہ تھی بھی اور مسافر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کے اُوپر ایک سوار تھا۔ لیکن ہم کو بڑی عمدہ جگہ مل گئی تھی اور ہم بڑے مزے میں سفر کر رہے تھے۔ بینا جنکشن پر گاڑی کے ٹھہرتے ہی ہماری جو کمبختی آئی تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر آگئے اور اس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی لیکن اب جو ہم گاڑی میں آکر دیکھتے ہیں تو ہماری جگہ پر ایک اور صاحب نہایت اطمینان سے تشریف رکھتے تھے۔ واللہ ان کا اطمینان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا یہ جگہ ان ہی کی تھی اور ہم زبردستی یا ان کی عنایت سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے ہم کو دیکھتے ہی نہایت لاپرواہی سے کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ

شاید یہ ہوا کھانے کے لئے آن بیٹھے ہیں۔ ابھی اُٹھ جائیں گے لہذا ہم نے شرافت کے ساتھ اُن سے اُٹھنے کا تقاضا بھی نہیں کیا اور چپ کھڑے رہے لیکن وہ اٹھنے ہی کا نام نہ لیتے تھے یہاں تک کہ ہم کو کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہو گیا جب ہم نے دیکھا کہ ان کا اطمینان بدستور قائم ہے اور وہ جگہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تو ہم نے ان سے عرض کیا :-

"اب ہٹیئے جناب میں بیٹھوں گا"

اُنہوں نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا۔

"اُدھر بیٹھ جاؤ"

ہم "آپ ہی کیوں نہ وہاں چلے جائیں میرا تو یہاں سامان وغیرہ رکھا ہے"

وُہ "سامان رکھا ہے تو ہم کیا کریں؟"

ہم "ارے بھئی یہ تو میری جگہ ہے"

وُہ "کیا تم نے یہ جگہ خریدی ہے جو تمہاری جگہ ہے"

ہم "خریدی تو نہیں ہے مگر میں یہیں پر بیٹھا ہوا تھا"

وُہ "تو اب ہم بیٹھے ہیں تم وہاں بیٹھو"

ہم "یہ تو اچھی زبردستی ہے"

وُہ "زبردستی کا ہے کی کیا ہم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے؟"

ہم "یہ کون کہتا ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے مگر دوسرے کی جگہ پر تو نہ بیٹھیے"

وُہ "خیر ہم تو نہیں ہٹیں گے"

ہم "ہٹو گے کیسے نہیں؟"

وُہ "اچھا دیکھتے ہیں تم ہٹا کیسے لیتے ہو؟"

ہم "نہیں ہٹو گے"

وُہ "نہیں!"

ہم "نہیں ہٹو گے؟"

وُہ "نہیں!"

ہم "کیوں آفت مچاؤ گے ہم پھر کہتے ہیں۔ ہٹ جاؤ"

وُہ "کہہ تو دیا ہم نہیں ہٹیں گے"

ہم "تم نہیں ہٹو گے؟"

وُہ "ہاں نہیں ہٹیں گے"

اب ہم کو بڑا تاؤ آرہا تھا اور ہم مارے غصّہ کے کانپ رہے تھے۔ اس وقت اگر بس چلتا تو اس بدتمیز کو ملتے مارتے فرش کر دیتے۔ مگر کیا کریں سفر کا معاملہ تھا اور

ہم نہنا تھے۔ لیکن چپ ہو رہنا بھی کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ ہم نے پھر کہا :-

ہم "تم نہیں ہٹو گے ؟"

وہ "نہیں ۔نہیں ۔نہیں"

اب ضبط ہمارے اختیار میں نہ تھا۔ ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا تو اُس نے دھکیل دیا اور ہم سامنے والی سیٹ کے مسافروں پہ گر پڑے۔ لیکن اُٹھ کر ہم نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا دے کر کھینچا لیکن اُس نے دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ پر تڑ سے وہ چانٹا رسید کیا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے۔ ؎

چمکنے سے جگنو کے تھا وہ سماں

ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں

والا منظر آگیا اور معلوم ہوا کہ جیسے ہم سینما دیکھ رہے تھے اور یہ فلم جل جانے والا اندھیرا اور روشنی تھی۔ لیکن دو ہی تین سیکنڈ کے بعد ہم پھر اس نامعقول پر جھپٹے اور خدا کی قسم اگر دوسرے مسافر بیچ میں نہ آجاتے تو اس بدمعاش کو مارتے مارتے اُلّو کر دیا ہوتا۔ لیکن ہم کو ہمارے ہمسفروں نے ایسے گھیرا کہ ہم گالیاں تو دیتے رہے۔ لیکن ہاتھ نہ ہلا سکے۔ بہرحال یہ واقعہ بھی خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن ہمارے مار کھا جانے

کے واقعات میں سے ایک ہے۔

ان تین واقعات کے بعد باہر کا تو کوئی ایسا واقعہ یاد آتا نہیں۔ لیکن گھر میں یہ اتفاق ہوئے ہیں مثلاً شادی ہی میں پھولوں کی چھڑیوں سے پٹے تھے لیکن ہم ان واقعات پر روشنی ڈالنا خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں وہ تو کہیئے برادرم عظیم بیگ صاحب چغتائی کی مروت تھی۔ ورنہ یہی واقعات مرتے دم تک ہمارے قلم یا ہماری زبان سے نہ نکلتے۔

ٹائیگر

میں نے کہا "شوں"

بیگم نے کہا "اوں"

ٹائیگر میرے قدموں میں پڑا ہوا زبان نکالے ہانپ رہا تھا اور بیگم صاحبہ کے قدم مع جوتیوں کے مسہری پر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔

"مجھے نہیں اچھا معلوم ہوتا"

میں نے پیار سے ٹائیگر کو دُلار سے دیکھتے ہوئے کہا "کون؟ میرا ٹائیگر؟"

جل کر کہنے لگیں "ہاں یہی موا، اسے یا تو باہر ہی رکھا کیجئے نہیں تو کسی دن میرے

ہاتھوں اس کی موت آجائے گی۔"

میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر کہا: "اے بیگم یہ کیا کہہ رہی ہو، تم کو اگر ٹائیگر کے احساسات اور جذبات کا احترام نہیں ہے تو کم سے کم میرا ہی خیال کرو کہ مجھ کو کتّے کی شان میں تمہاری یہ گستاخیاں کس قدر بُری معلوم ہوتی ہیں، اس قدر عالی خاندان کتّا، اس قدر قیمتی جانور، اس قدر وفاشعار رفیق اور اس کو تم اس طرح بُرا بھلا کہتی ہو؟"

جلبلا کر بولیں: "ہاں میں تو اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اس موتے موذی کو کہونگی، اگر آپ کو اپنے کتّے کا ایسا ہی خیال ہے تو اس کو باہر رکھا کیجئے، گھر میں آیا تو ٹانگ توڑ دونگی۔"

معلوم نہیں بیگم کی اس بداخلاقی پر ٹائیگر اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا، بہرحال خود ہم کو اپنے معزز کتّے کی اس کھلی ہوئی توہین پر قلبی اذیّت ہوئی اور ہم فوراً "آؤ بیٹا" کہہ کر ٹائیگر کو ساتھ لئے ہوئے باہر چلے گئے اور یہ طے کرکے کہ آج سے بیگم کو ٹائیگر سے پردہ کرائیں گے، چوکیدار سے کہہ دیا کہ دیکھو ٹائیگر کو باہر ہی رکھا کرو اندر نہ جانے پائے اور جب ہم نہ ہُوا کریں تو اس کو باندھ دیا کرو۔

اس دن کے بعد سے ٹائیگر کبھی اندر نہ گیا۔ بیگم کو تو اطمینان تھا۔ لیکن ہم کو اس

خانہ جنگی اور فرقہ دارانہ باہمی اختلاف سے سخت تکلیف تھی، ہم چاہتے یہ تھے کہ گھر پر آکر اپنے رفیق ٹائیگر اور اپنی رفیقۂ حیات دونوں سے بیک وقت دلچسپی لیں، لیکن بیگم کی ضد نے ہم کو مجبور کر دیا تھا کہ ہم گھر کے اندر کچھ وقت گذاریں اور کچھ ٹائیگر کے پاس باہر، مختصر یہ کہ جس جھگڑے کی وجہ سے ہم ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کے مخالف تھے وہی جھگڑا بغیر دوسری شادی کئے ہوئے ہمارے گھر میں موجود تھا۔ پھر بھی ہم مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ بیگم کو سمجھا بجھا کر ٹائیگر سے مصالحت کرا دیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ گھریلو اختلاف ختم ہو جائے۔

ایک دن صبح کے وقت میز کی ایک طرف بیگم بیٹھی تھیں اور دوسری طرف ہم، بیار نوشی کے ساتھ ساتھ بیگم کو خوش اخلاق اور ہنس مکھ پا کر ہم نے ٹائیگر کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے مگر بیگم نے کہا:۔

"آخر آپ کو یہ موا کتا کیا پسند ہے، مجھ کو تو صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے"

ہم نے کہا "میں سمجھتا تھا کہ آپ اس کو مذہباً گھر کے باہر رکھنے پر مُصر ہیں آج معلوم ہوا کہ آپ محض ڈرتی ہیں؟"

جلدی سے کہنے لگیں "ہاں مذہباً بھی کتا گھر میں رکھنا کوئی ثواب نہیں ہے"

ہم نے کہا: "ایک بات بتائیے کہ آپ ڈرتی ہیں یا مذہباً کتے کو الگ رکھنا چاہتی ہیں؟"

کہنے لگیں: "دونوں باتیں ہیں، موئے کی صورت بھی تو کیسی خوفناک ہے۔"

ہم نے کہا: "نہیں تو اس کو تو بڑی بڑی یوروپین عورتیں دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو جاتی ہیں اور بڑے بڑے کتوں کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ مجھ کو خوش قسمتی سے ایسا کتا مل گیا ہے، اس کا شجرہ اگر تم دیکھو تو تم کو پتہ چلے گا کہ کتنا عالی خاندان اور نجیب الطرفین ہے۔"

بیگم نے منہ چڑھا کر کہا: "آگ لگے اس موئے کی شرافت میں اور جھاڑ و پھرے اس کی صورت پر، میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ اس سے بلی پال لیتے، مجھ کو بلی اچھی لگتی ہے اور وہ ناپاک بھی نہیں ہوتی۔"

ہم نے ہنس کر کہا: "بلی۔؟"

آواز آئی: "کھل گیا، کھل گیا۔"

اور بیگم گڑبڑا کر اس طرح کرسی سے اُٹھ کر میز پر پھاند پڑیں کہ ایک بھونچال آگیا، چائے کے کچھ برتن زمین پر گر کر ایک ایک کے دس دس ہو گئے اور کیتلی مع دودھ دان کے ہماری گود میں اس طرح آرہی کہ ہم بھی ناچ گئے۔ البتہ ٹائیگر صاحب کرسی

کے قریب زبان نکالے ہوئے کر مٹکا مٹکا کر دم ہلا رہے تھے اور میز پر چڑھی ہوئی بیگم کے منہ سے الفاظ تک نہیں نکلتے تھے۔ ہم بڑی دیر کے بعد سمجھ سکے کہ کیا واقعہ ہوا ہے اور جب حواس بجا ہوئے تو بیگم کی حماقت پر خاموش ہنسی ہنستے ہوئے ٹائیگر کا پٹہ پکڑ کر باہر چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے ہم کو پورا یقین ہو گیا کہ بیگم اور ٹائیگر کے درمیانی اختلافات کو مٹانا ممکن ہی نہیں ہے اچنانچہ ہم نے پھر اس کی کوشش بھی نہیں کی البتہ ہم کو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں بیگم صاحبہ ہمارے عزیز از جان ٹائیگر کو زہر نہ دیں یا کسی نوکر کو رشوت دے کر اس کو قتل نہ کرا دیں۔ چنانچہ اس کے لئے تو ہم نے نوکروں کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ٹائیگر کا بال بھی بیکا ہوا تو ملازموں میں سے کوئی بھی پھانسی سے نہ بچ سکے گا۔ لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ بیگم کو بھی اس عذاب جہنم سے ڈرا دیں جو کتے کو قتل کرنے یا کرانے یا زہر دینے یا دلوانے کے بعد خدا کے یہاں انسان پر ہوتا ہے، چنانچہ ہم نے بیگم سے کہا۔

"اب ٹائیگر کے لئے باقاعدہ انتظام کر دیا ہے کہ وہ کبھی گھر میں نہ آنے پائے۔"

بیگم نے کہا: "اب کی آیا تو اس کی قضا بھی آجائے گی۔"

ہم نے کہا "نہیں۔ اب وہ نہیں آئے گا، مگر دیکھئے کہیں آپ یہ حرکت نہ کر

بیٹھیئے گا کہ اس بے زبان جانور کو زہر دے کر مار ڈالیں، اس لئے کہ بڑا گناہ ہے۔"

بیگم نے لاپروائی سے کہا "ہاں کُتّے کو مار ڈالنا گناہ ہے، اور کتّے کو پالنا تو گویا ثواب ہی ہے۔"

ہم نے وحشت ناک صورت بنا کر کہا: "نہیں واقعی کسی بے زبان جانور کو مار ڈالنا تو ایسا گناہ ہے کہ اس کا عذاب جیتے جی گھر بھر کو بلکہ خاندان بھر کو ملتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میر کاظم علی نے اپنے کتے کو مار ڈالا اس بے زبان کا ایسا صبر پڑا کہ پہلے تو اسی ہفتہ میں ان کا جوان لڑکا مرا، پھر دوسرے ہفتہ میں جوان لڑکی مع نواسے کے ختم ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد داماد مر گئے، پھر بیوی نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی۔ بلکہ مرتے وقت کتّے کی صورت ہو گئی اور ابھی تین چار دن ہوئے کہ وہ بے چارے خود مرے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کا دم بالکل کتے کی طرح نکلا ہے بلکہ وہ بھونک بھی رہے تھے۔

بیگم نے خوف کے مارے پھریری لیکر کہا: "یا اللہ توبہ ہے۔"

ہم اپنی کامیابی پہ دل میں خوش ہوتے اور کہا۔ "واقعی توبہ کا مقام ہے بے زبان جانور کو مار ڈالنا اچھا نہیں ہوتا۔"

بہرحال اس برمحل ترکیب سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ بیگم صاحبہ نے قتلِ ٹائیگر سے

ہاتھ اٹھالیا لیکن وہ یہ برابر کہتی رہیں کہ "اگر گھر میں آیا تو ٹانگ توڑ دوں گی"

ہم نے کہا "ہاں اگر تم خود ٹانگ توڑنے کی ہمت رکھتی ہو تو میں ابھی ٹائیگر کو حاضر کرتا ہوں"

بیگم نے جلدی سے کہا "دیکھئے آپ کو خدا کی قسم جو لائے"

ہم نے کہا "نہیں آپ شوق سے ٹانگ توڑیں" اور یہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھے۔

بیگم نے ہاتھ پکڑ کر کہا "دیکھئے اچھا نہ ہوگا"

اور ہم ہنستے ہوئے دفتر چلے گئے۔

دفتر سے واپس آکر سب سے پہلے ٹائیگر کی کوٹھڑی میں گئے۔ لیکن وہاں ٹائیگر کا کہیں پتہ نہ تھا، دل دھک سے ہوگیا کہ ہو نہ ہو آج بیگم نے اس بے زبان کو خدا جانے کس عذاب میں مبتلا کیا ہوگا، معلوم نہیں مار ڈالا یا کہیں چھڑوا دیا گیا۔ بہرحال اب ہم کو پورا یقین ہوگیا تھا کہ ہم سے بچھڑا ہوا ٹائیگر اب ہم کو نہ ملے گا۔ بیگم کے ظلم پر غصہ آرہا تھا اور دل چاہتا تھا کہ ہم بھی گھر میں نہ جائیں، چھجو کیدار سے پوچھا تو وہ گدھا فوراً دوڑ کر کوٹھڑی میں گھس گیا جہاں ہم خود دیکھ چکے تھے کہ ٹائیگر نہیں ہے اور وہاں سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے ڈانٹ کر پوچھا "کہاں ہے ٹائیگر"

کہنے لگا: "حضور ابھی یہیں تھا۔"

ہم نے گھونسہ تان کر کہا: "تو کیا ہوا بتاؤ، نہیں تو جان لے لونگا۔"

کہنے لگا: "حضور ابھی میں نے اس کو دودھ دیا تھا، کوئی پانچ منٹ ہوئے۔"

ہم نے کہا: "کیا تجھ سے بیگم نے اس کو کہیں چھڑوایا نہیں؟"

کہنے لگا: "نہیں حضور۔"

ہم نے کہا: "اچھا ٹھہرو تم ابھی میں بتاتا ہوں"، اور ہم خود دندناتے ہوئے گھر کے اندر گئے کہ آج ٹائیگر کی دشمنی کا بدلہ لیں گے اور خود بھی اس گھر سے جدھر مُنہ اُٹھیگا چلے جائیں گے، لیکن گھر میں جا کر عجیب نقشہ دیکھا ٹائیگر صاحب تو نہایت متانت سے بیچ صحن میں کھڑے ہوئے دم ہلا رہے تھے اور بیگم صاحبہ لاپتہ تھیں۔ ہم نے آواز دی: "آپ کہاں ہیں؟"

جواب آیا: "ہٹائیے اس موذی کو۔"

ہم نے پھر آواز دی: "آخر آپ ہیں کہاں، میں نے اس کو پکڑ لیا ہے۔"

جواب آیا: "نہیں اس کو پہنچا دیجئے۔"

اب جو ہم دیکھتے ہیں تو غسلخانہ میں اندر سے زنجیر لگی ہوئی ہے ہم نے ٹائیگر کو باہر پہنچا کر چوکیدار کے سپرد کر دیا اور فوراً اندر آ کر کہا۔

"ٹائیگر باہر گیا اب آپ نکلیئے۔"

بیگم بالکل ٹائیگر کی طرح ہانپتی ہوئی غسل خانہ سے اس طرح برآمد ہوئیں کہ نہ پیر میں جوتا، نہ سر پر دوپٹہ۔ ہم نے کہا "آخر یہ بھی کوئی وحشت ہے چوکیدار کو بلوا کر ٹائیگر کو باہر بھجوا دیا ہوتا۔"

کہنے لگیں "جی ہاں باہر بھجوا دیا ہوتا، وہ موا ایک دم سے سر پہ آ گیا۔ میں بیٹھی ہوئی میز پوش کی جھالر بن رہی تھی کہ اس موئے کتے کے ہانپنے کی آواز آئی اب جو منہ اٹھا کر دیکھتی ہوں تو وہ بالکل سر پہ کھڑا ہوا تھا، میرا تو دم ہی نکل گیا، آپ آج ہی اس کو گھر سے نکال دیجئے نہیں تو کسی دن مر جاؤں گی۔"

ہم نے بھی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ صورت نبھنے والی نہیں ہے، چنانچہ اب ٹائیگر تو ہمارے دوست مسٹر اسکاٹ کے یہاں ہے جن کی بیوی کو اس سے اس قدر محبت ہے کہ شاید مسٹر اسکاٹ سے بھی نہ ہو گی اور ہمارے گھر میں بھی امن ہے۔ بلکہ ہم میاں بیوی کے تعلقات اب پہلے سے زیادہ خوشگوار ہیں، معلوم ہوا کہ ٹائیگر ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج کی حیثیت رکھتا تھا۔

عُمدہ الحُکماء

گو ہم کو آپ نہیں جانتے نہ جان سکتے ہیں، ہم سے پوچھیے۔ بلکہ ہمارے دل سے پوچھیے کہ یہ حضرت ہیں کیا چیز۔ دنیا میں بہت سے ذہین دیکھے ہیں ایک سے ایک چلتے ہوئے بقراطوں سے پالا پڑا ہے۔ مگر یہ شخص تو بلا ہے بلا۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں پڑھا۔ انگریزی اخبار سے دیکھئے تو اُلٹا اور سیدھا نہ سمجھ سکیں۔ مگر دو سال تک کلب کا ممبر رہا۔ اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہن کر آتا تھا اور برج کھیلتے ہوئے "نو بڈ" اور "نو ٹرمپس" کہنے کے علاوہ کمال یہ تھا کہ لوگ اس سے گھنٹوں انگریزی میں باتیں کرتے تھے اور وہ "یس" اور "نو" ایسے ایسے مقامات پر کہتا تھا کہ کبھی جو غلطی کرے۔

مدتوں لوگ اس کو گریجوایٹ سمجھا کرتے تھے اور جب لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرت انگریزی کے آس پاس بھی نہیں گذرے تو یقین مشکل سے آتا تھا۔ اردو اور فارسی بھی واجبی ہی سی جانتے تھے مگر شعراء کی محفل میں اس ٹھاٹھ سے داد دیتے تھے گویا سند عطا کر رہے ہیں۔ پڑھے لکھوں میں بیٹھ کر ادبی مباحث پر ایسی رائے زنی فرماتے تھے گویا اگر آپ رائے نہ دیتے تو یہ مبحث تشنہ رہ جاتا۔ پیشہ بظاہر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا مگر مصروفیت بے حد تھی اور یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اچھے سے اچھا کھاتے ہیں اور اچھے سے اچھا پہنتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں پہنچ تھی۔ ہر دفتر میں ایک آدھ دوست پال رکھا تھا۔ اور ہر محکمہ میں آپ کے واقف کار موجود تھے۔ خیر یہاں تک تو غنیمت تھا۔ مگر یکایک آپ غائب ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ صاحب ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں ہے۔ حسنِ ظن سے کام لیجئے تو جن اور سچ پوچھئے تو بھوت تھا۔ کسی نے کہا "مقروض ہو گیا تھا اپنی شان کے پیچھے خودکشی کر لی ہوگی۔ عام رائے یہ تھی کہ لڑائی پہ چلا گیا اور انیس کا خیال یہ تھا کہ سزا ہو گئی۔

دو سال کے بعد لاہور میں ایک دن انیس نہایت بدحواسی کے ساتھ ہنستا ہوا گھر واپس آیا۔ انیس مجھ سے ملنے لاہور آیا ہوا تھا۔ مگر میں نے اپنے ہی محکمہ میں انیس کے لئے بھی ایک جگہ نکلوا کر اس کو اپنے ہی ساتھ رکھ لیا تھا۔ خیر یہ تو ایک غیر متعلق

سی بات تھی۔ اس وقت تو میں انیس کی ہنسی سے پریشان تھا کہ آخر یہ کس ولایت قہقہہ سے آیا ہے کہ ہنسی کسی طرح دم ہی نہیں لینے دیتی۔ آخر میں نے ڈانٹ کر کہا۔ آخر بات تو بتاؤ یا خواہ مخواہ کی بدمذاقی کر رہے ہو۔"

انیس نے ہنستے ہوئے کہا "عمدۃ الحکماء" اور پھر وہی پیٹ پکڑ پکڑ کر قہقہے۔ بمشکل تمام آدھ گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ کریم زندہ ہیں۔ جیل میں نہیں بلکہ لاہور میں عمدۃ الحکماء بنے ہوئے ہیں اور مطب فرماتے ہیں۔ مطب خوب چل رہا ہے اور اچھی خاصی آمدنی ہے۔"

میں نے کہا "مگر سوال تو یہ ہے کہ یہ حکیم بنا کیسے۔"

انیس نے کہا "کہتا ہے باقاعدہ طب پڑھی ہے۔ امتحان دیا ہے سند لایا ہوں۔"

میں نے کہا "مگر بھائی طب پڑھنے کے لئے بھی تو آخر کچھ نہ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کا آخر کیا انتظام ہوا ہوگا۔"

انیس نے کہا "اب یہ تم خود اس سے پوچھنا۔ اجی صاحب وہ تو بڑے رعب داب سے مطب کرتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی بیٹھک میں نہایت شاندار فرش پر مسند اور گاؤ تکیہ لگا کر پیچوان لئے بیٹھا تھا۔ شاگرد نسخے لکھ رہے تھے اور مرضیوں

کا وہ ہجوم تھا کہ میں کیا کہوں۔ مجھ سے نہایت لئے دیئے ملے اور آج رات مجھے اور تم کو کھانے پر بلایا ہے۔"

شام کو انہیں نے ایک شاندار مکان کے قریب جا کر کہا۔ "پڑھیے سائن بورڈ۔ مطب عمدۃ الحکما حکیم مولوی محمد عبدالکریم صاحب نبیرہ حکیم الحکما الحاج حکیم مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم طبیب شاہی دربار مہاراجہ صاحب بہادر کچھ ج" اس عظیم الشان بورڈ کو پڑھ کر بہت سے تندرست بیمار ہو چکے ہوں گے۔ مگر ہم کو کہ ہم نے یعنی عمدۃ الحکما بلکہ نبیرہ حکیم الحکما نے بیمار ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور عین اسی وقت جب کہ ہم سائن بورڈ پڑھنے میں مصروف تھے۔ حکیم صاحب کی مرعوب کر دینے والی لینڈو پھاٹک پر آ کر رکی۔ حکیم صاحب غالباً مریضوں کو دیکھنے تشریف لے گئے تھے ہم لوگوں کو دیکھ کر نہایت خلوص سے معانقہ فرماتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ کیا ستم ہے کہ۔۔۔

ہزاروں قربتوں پر یوں مرا مہجور ہو جانا

سوال یہ ہے کہ آخر تم کب سے لاہور میں ہو"

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے حکیم صاحب کے ایوان تک پہنچ گئے۔ اس عرصہ میں ان کی لاہور آنے کی وجہ۔ مدّتِ قیام اور اسی قسم کی حدود اربعہ نما باتیں بتا دیں۔ حکیم صاحب

نے ہم کو بٹھاتے اور خود بیٹھتے ہوئے کہا "شادی بھی کی تم نے مسخرے آدمی یا اب تک واحد حاضر ہو"

الہام اس کو کہتے ہیں کہ فوراً ایک بات سوجھ گئی۔ عرض کیا۔ جی ہاں۔ شادی کیا کی ہے ایک مصیبت مول لے لی ہے۔ جب سے نیک بخت آئی ہے ایک دن تندرست رہی نہیں۔

انیس نے گھور کر ہم کو دیکھا مگر ہمارے اشارے پر وہ خاموش رہا۔ حکیم صاحب نے توجہ سے پوچھا "کیا علالت کیا ہے؟"

ہم نے کہا "کیا کہوں کریم بھائی دنیا بھر کے علاج کر ڈالے مگر مرض کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اب تو گویا گھر ہی کا حکیم ہے تم خود دیکھ لینا"

آمادگی سے فرمایا "جب کہو آ جاؤں یا جب چاہو لے آؤ"

ہم نے وعدہ کر لیا کہ کل ہی لائیں گے۔ آخر علاج میں بلاوجہ دیر کیوں ہو"

حکیم صاحب کے یہاں سے پُر تکلف مقویات تناول کر کے جس وقت ہم دونوں واپس ہوئے۔ انیس نے حکیم صاحب سے رخصت ہوتے ہی بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

"آخر یہ حرکت کیا تھی۔ یعنی خواہ مخواہ ایک بیوی بھی تصنیف کر لی اور فی البدیہہ اس نو تصنیف بیوی کی علالت بھی"

ہم نے کہا " آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا "

انیس نے کہا " مثلاً "

ہم نے کہا " مثلاً یہ کہ بہت بننے لگا ہے یہ ، اور قسمے لو مجھ سے جو طب کی دُم کا بھی اس کو پتہ ہو ۔ کل لاؤں گا میں اپنی بیوی کو اور مستقل طور پر ہو گا ان حضرت کا علاج کچھ دن یہی تماشہ سہی "

انیس نے حیران ہو کر پوچھا " وہ ٹھیک ہے مگر بیوی کا انتظام کہاں سے کرو گے ۔

ہم نے کہا " ارے بھائی سخت کودن ہو یعنی تم جو موجود ہو "

چلتے چلتے ٹھہر کر بولا " کیا مطلب "

ہم نے کہا ۔ مطلب یہ کہ کل تم کو پردہ دار تانگہ پر لاؤں گا ۔ پردہ کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ تمہاری نبض دیکھیں گے ۔ حال سنیں گے ۔ نسخہ لکھیں گے ۔ پھر مستقل طور پر علاج ہوتا رہے گا ۔ کبھی تم مجھ کو لے آنا کبھی میں تم کو لے آیا کروں گا جب تم لاؤ گے مجھے تو کہہ دینا میرے متعلق کہ کام پر گیا ہوا ہوں اور تم گویا اپنی بھابی کو لے آئے ہو ورنہ میں خود تم کو لے آیا کروں گا "

انیس نے اچھل کر کہا " سخت لفنگے ہو تم ۔ مگر تمہاری قسم رہے گا لطف "

دوسرے دن انیس کو پردہ دار تانگہ میں لے کر جب ہم عمدۃ الحکما کے مطب میں پہنچے ہیں تو واقعی غضل کے مریضوں کا کافی ہجوم تھا جو اس جاہلِ مطلق کو طبیبِ حاذق سمجھ کر مرنے کے لئے جمع تھے۔ حکیم صاحب نے ہم کو دیکھتے ہی اپنے دوسرے مریضوں کو چھوڑا اور خود اُٹھ کر تانگے کے قریب آ گئے۔ ہم نے عرض کیا:-

"میں مختصراً حال بیان کر دوں پہلے"

ڈانٹ کر بولے "نہایت بدتمیز ہیں آپ۔ ٹھہرئیے۔ آداب عرض بجا لائی"

ہم نے پردہ کے اندر منہ ڈال کر دیکھا تو انیس کا ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا۔ "تم خود کیوں نہیں کہتی ہو۔ اچھا۔ اچھا۔ خیر۔ بھئی وہ بھی سلام کہہ رہی ہیں"

حکیم صاحب نے فرمایا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب بیان کیجئے حال"

ہم نے کہا "بھئی ان کی علالت کا سلسلہ ایک سال سے چل رہا ہے"

حکیم صاحب نے بات کاٹ کر کہا "آپ بیان کرتے رہیئے میں نبض دیکھو نگا ذرا" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے پردہ میں ہاتھ ڈال دیا اور انیس نے نبض دکھانے کے لئے ہاتھ دے دیا۔ ہم نے بیان کرنا شروع کیا۔

"پہلے تو ان کو صرف نزلہ تھا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے دورے پڑنے لگے"

حکیم صاحب نے سمجھتے ہوئے کہا "اچھا — اچھا — پھر"

ہم نے کہا "انسائیکلوپیڈیا کے دوروں نے ان کو بہت کمزور کر دیا"

حکیم صاحب نے کہا "وہ تو ہونا ہی ہے پھر"

ہم نے کہا "ان دوروں کا علاج حکیم محمد امین صاحب نے کیا۔ دورے تو جاتے رہے مگر وٹامن ڈی کی شکایت ہو گئی"

حکیم صاحب نے تشویش سے کہا "ارے۔ رے۔ ارے حکیم امین صاحب کو پہلے سے روک تھام کرنا تھی"

"پردے کے اندر سے آواز آئی۔ کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔ کھی کھی کھی"

ہم نے برجستہ کہا "اب آج کل یہ حال ہے۔ کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ٹرانسمٹر ہو جاتا ہے"

حکیم صاحب نے کہا "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ تشنجی کیفیت بھی ہے اور نبض کی رفتار بھی تیز ہے"

ہم نے کہا "یہاں لاہور میں ڈاکٹر ممتاز صاحب کا علاج تھا۔ ان کا خیال ہے

کہ پرانی قسم کا کانسٹیپیشن نوبل ہے۔"

ذہانت دیکھیے کہ کانسٹیپیشن نوبل پر کانسٹی پیشن کا شبہ کر کے کہا "قبض کی شکایت بھی ہے"

ہم نے کہا۔ جی ہاں نہایت سخت اور اختناق الرحم کی مریضہ بھی رہ چکی ہیں۔ پھر یہ کہ بچپن میں ایک مرتبہ ولاڈی واسٹک کا شدید حملہ ہوا تھا"

حکیم صاحب نے غور سے سنتے ہوئے کہا "کچھ حالات مجھ کو دائی سے بھی پوچھنا ہوں گے"

ہم نے کہا "میں نے ان کو لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھایا تھا وہ کہتی ہے کہ یہ سب فنر کس کی خرابی ہے"

حکیم صاحب نے کہا "بکتی ہے اس کا تو کہیں پتہ بھی نہیں ان کے لئے نسخہ لکھتا ہوں انشاء اللہ ایک ہفتے میں دیکھیے گا کتنا فرق ہوتا ہے جڑے بڑے ناموں کی جو بیماریاں آپ کو اور ان کو بتا دی گئی ہیں ان کا کم از کم اب کوئی اثر نہیں ہے اگر ان کو مقوی بدن اور مولدِ خون ادویہ دی جائیں تو آنتوں کا جگر کا اور گردوں کا طبعی وظیفہ اعتدال پر آجائے گا۔ دراصل ان کے لئے تحفظِ قویٰ کی اشد ضرورت ہے"

ہم نے کہا: "اور حکیم صاحب رڈیارڈ کپلنگ؟"

کہنے لگے: "نہیں صاحب وہ نہیں بالکل نہیں۔ آپ آیئے میں نسخہ دیتا ہوں۔"

حکیم صاحب سے جس وقت نسخہ لے کر ہم لوٹے ہیں۔ انیس کی حالت غیر تھی۔ سانس اُکھڑ چکی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہاتھ پاؤں یخ ہو رہے تھے۔ بمشکل تمام جب اس کی حالت قابلِ اطمینان ہوئی تو اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"میں اس مذاق میں مر جاؤنگا۔ ناممکن ہے ضبط کرنا۔"

ہم نے کہا: "اب کل یہ کرنا کہ میں تانگہ میں رہوں گا اور تم حکیم صاحب سے حال کہنا۔"

انیس نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ نا بابا مجھ سے ضبط نہ ہو سکے گا۔ فوراً ہنسی آ جائے گی یہ کمبخت تو جیسا کلب کا ممبر اور جیسا برج کا کھلاڑی تھا۔ ویسا ہی حکیم بھی ہے۔"

ہم نے کہا: "مگر دیکھتے ہو کہ کسی جگہ اپنی نااہلی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔"

انیس نے کہا۔ مگر ایک بات ہے۔ کہ اب اس کو کچھ باتیں کرنا آ گئی ہیں۔ مثلاً مقوی بدن، مولد خون، جگر اور گردوں کا طبعی وظیفہ، تحفظ قوٰی۔ اس نے طب پڑھی ضرور ہے۔"

ہم نے وثوق سے کہا: "احمق ہیں آپ میں لکھ سکتا ہوں کہ یہ تمام معلومات دواخانوں کے اشتہارات سے حاصل کی ہیں۔ آخر نوبٹ اور ٹونوٹہ پیس بھی تو کہتا تھا۔"

انیس نے کہا: "مگر اس مذاق کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

ہم نے کہا "بڑا نتیجہ خیز مذاق ہے جناب کم سے کم اس کو یہ تو معلوم ہی ہو جائیگا کہ ہم لوگ اتنے گدھے نہیں ہیں جس قدر صورت سے نظر آتے ہیں اس کو صرف یہ بتا دینا ہی کافی ہے کہ اور کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔"

دوسرے دن ہم تو تانگے ہی میں رہے اور انیس نے حکیم صاحب سے گویا اپنی بھابی کا حال کہہ دیا کہ دائی نے دیکھ کر کیا بتایا ہے اور کل دوا پینے کے بعد ان کی کیا کیفیت رہی۔ حکیم صاحب نے تانگہ کے پاس آکر ہماری نبض دیکھی انیس حال بیان کر رہا تھا دائی کا خیال یہ ہے کہ رحم میں کچھ انٹر بیشنل کیفیت ہے۔"

حکیم صاحب نے کہا: "یہ بھی اسی کا خیال تھا مگر آج نبض کی حالت بہتر ہے۔"

انیس کمبخت نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مارے ہنسی کے قلابازی کھا گیا اور حکیم صاحب حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر خود ہم کو حکیم صاحب کی حیرت دور کرنے کے لئے باہر آنا پڑا۔ حکیم صاحب نے اور بھی بھونچکا ہو کر پوچھا: "یہ یعنی یہ کیا حرکت تھی۔"

دیر تک ہنسنے کے بعد ہم نے کہا: "صرف تم کو یہ بتانا تھا کہ تم کم سے کم ہم سے

زنبو۔ تمہاری پاس طبابت کے ڈھونگ کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔"

انیس نے ہنستے ہوئے کہا "مگر کمال ہے کہ یہ کم کہ ایسا باقاعدہ حکیم بنا بیٹھا ہے۔"

حکیم صاحب نے سنجیدگی سے کہا "وہ تو میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ نبض تو ہے مردانہ اور بیماریاں جتنی بتاتی ہیں وہ سب زنانہ ہیں آخر یہ ماجرا کیا ہے۔"

انیس نے ہنستے ہوئے کہا "اسے قتل کر ڈالو بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دو مگر کیا مجال ہے کہ اپنے بہروپ کو کبھی بھی تسلیم کرلے۔"

حکیم صاحب نے کہا "مگر لاحول ولا قوۃ ایسا خطرناک مذاق کرتے ہوئے اچھا میں بھی سمجھو تم نگا سے سمجھتے تو خیر وہ کیا مگر دنیا کو اپنا حکیم ہونا سمجھا خوب رہے ہیں مطب میں ہجوم بڑھتا ہی جاتا ہے اور روپیہ کی موسلادھار بارش ہو رہی ہے۔ حکیم صاحب سے پوچھنا یہ ہے کہ گدھے کے لئے خشکہ مفید ہوتا ہے یا مُضر۔"

اختلاج

خدا اپنے ہر بندے کو دولتِ اختلاجِ قلب سے مالا مال کرے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد!

بات یہ ہے کہ جناب یہ خاکسار کوئی خود غرض تو ہے نہیں کہ ایک نعمتِ عظمیٰ کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لے اور اپنے علاوہ دنیا میں کسی اور کو اختلاجِ قلب کے مرض میں مبتلا ہی نہ ہونے دے ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام احباب اعزہ کو، ہمارے تمام ہمدردوں اور غمگساروں کو اور ہر دوست اور دشمن کو اگر خدا کسی مرض میں مبتلا کرے تو وہ مرض اختلاج اور صرف اختلاج ہو۔ بلکہ اگر کسی شخص کی قسمت میں کوئی

بھی مرض نہ لکھا گیا ہو صرف تندرستی ہی لکھی ہوئی ہو تو بھی اس کو خداوند عالم اپنے خزانۂ غیب سے اختلاجِ قلب عطا کرے۔ ہم اختلاج کے پرانے مریض ہیں اتنے پرانے کہ ع

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

اور اسی مرض کی بدولت دنیا کے جو لطف ہم نے اٹھائے ہیں ان کو یا تو ہم جانتے ہیں یا دوسرے اہلِ اختلاج جانتے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر غذا کا جواب ایک سے ایک لاجواب پھل اپنی تمام شادابیاں لئے ہوئے دست بستہ پلیٹ کے اندر رکھا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ انگور، انار، سیب، سنگترہ، سردا، مختصر یہ کہ جملہ انواع و اقسام کے شاداب اور شیریں، مفرّح اور لذیذ پھل ہونگے۔ خوشبودار تر تراتا ہوا گاجر کا حلوہ۔ جس میں جواہر کا میوہ ہوگا اور اوپر سے چاندی کے ورق۔ خوشبو ایسی کہ معدہ اپنا منہ کھول دے۔ سیب کا مربہ اور ورقِ نقرہ، پیچیدہ بجو دنہ" اعلیٰ درجہ کے ٹھنڈے، خوشبودار اور میٹھے شربت۔ پھر ہر ایک پر حکومت کیجئے، وفتر سے چھٹی لیکر چارپائی پر پڑے رہیئے۔ کہہ تو دیا کہ اختلاجِ قلب کا مرض پیدا کیجئے اور دنیا میں جنّت کا لطف حاصل کیجئے۔ زندگی کو زندگی بنایئے اور جنّت سے جُدا رہ کر جنّت میں داخل ہو جایئے۔ یہ ہمارا ذمہ کہ اگر ایک مرتبہ بھی اختلاج کی چاٹ آپ کو لگ

گئی تو پھر آپ ہی یہ دعا دیں گے کہ خدا کرے اس مرض میں اضافہ ہو۔ع۔

قرار ہو نہ دلِ بے قرار کو یارب

ہماری زندگی اور کسی حیثیت سے خواہ کتنی ہی عبرت انگیز کیوں نہ ہو مگر اس حیثیت سے یقیناً قابلِ رشک ہے کہ ہم بفضلہٖ اختلاج کے مریض ہیں اور اپنے اس مرض کو ہم نے اس قدر تخویف آمیز بنا رکھا ہے کہ ہمارے لئے ہر ایک دست بدعا رہتا ہے کہ خدا ہم کو شفائے کامل عطا فرمائے مگر یہ دعا اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ خود ہم ہر وقت یہی دعا کرتے ہیں کہ جیتے جی اس مرض سے خدا ہم کو محروم نہ رکھے۔

شادی سے قبل اور تعلیمی زمانہ میں تو خیر اس مرض سے اتنا ہی فائدہ ہوتا تھا کہ اسکول سے چھٹی مل جاتی تھی اور گھر پر پھل وغیرہ سے ہماری ہر وقت تواضع ہوتی تھی۔ مگر شادی کے بعد تو یہ پتہ چلا کہ اگر کسی فرمانبردار بیوی کے شوہر کو خدا نے اختلاج کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور اس اختلاجی شوہر میں ذرا بھی عقل ہے تو وہ شاہی کر سکتا ہے گھر بیٹھے اور اپنا ایسا رعب قائم کر سکتا ہے کہ مسولینی بھی دیکھے تو ششدر رہ جائے۔ ہوتا یہ ہے کہ دفتر سے آئے ہیں اور اختلاجِ قلب کی رعایت سے فواکہات سے ناشتہ کرنے کے بعد گاجر کے حلوے سے شغل فرما رہے ہیں کہ بیگم صاحبہ نے سالِ رواں کا بجٹ پیش کرتے ہوئے یہ شکایت کی کہ خرچ بڑھتا ہی جاتا ہے اور آمدنی کی کوئی

صورت پیدا نہیں ہوتی وہی مقررہ تنخواہ ہے اور خرچ کی غیر محدود مدیں۔ بیماریاں ہیں کہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ وہ افزائش کا مطالبہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لالف انشورنس کمپنی والے صبر کر کے بیٹھ رہے ہیں اور پالیسی ختم ہو گئی ہے۔ بچوں کی فیس الگ کھائے جاتی ہے اور اب اللہ رکھے پاس ہوئے ہیں تو نئی کتابوں کی فکر ہے۔ نوکروں کی تنخواہ کا قصہ یہ ہے کہ :-

ہم نے بات کاٹ کر کہا :-

بیگم یہ تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں۔ تم جانتی ہو کہ میں مریض ہوں۔ اپنی زندگی سے عاجز جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہل کے پانی نہ پیتا۔

بیگم نے عاجزی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ ہی بتلائیے کہ میں کیا کروں اور کس سے کہوں۔ اب یہ دیکھئے کہ اسلم میاں کے یہاں آج ہی کل میں ولادت ہونے والی ہے مجھ کو چاہیئے تو یہ کہ ماں باپ اور بچے کو جوڑے دوں اور ......"

ہم نے الجھ کر کہا "میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں اور آپ کو جوڑوں کی پڑی ہے۔ اُف ——— اف ——— اُفوہ"

ہم نے بدحواس ہو کر ٹہلنا شروع کر دیا اور بیگم بیٹھے بیٹھے بدحواس ہو گئیں۔ ہم

کو مصلحتاً اختلاج شروع ہوا۔ ان کا دل سچ مچ دھڑکنے لگا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے چارپائی پر بیٹھے اور قمیض کے بٹن کھول کر وحشت ناک صورت بنا کر لیٹ گئے۔ انہوں نے خود پنکھا جھلنا شروع کیا اور ملازمہ کو ہدایت کی کہ فوراً برف ملا کر بید مشک کا شربت تیار کرے۔ ملازمہ نے گھر بھر میں یہ خبر کر دی کہ میاں کو اختلاج کا دورہ ہوا ہے اور گھر کا ہر چھوٹا بڑا ہماری خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کوئی شربت پلا رہا ہے کوئی پنکھا جھل رہا ہے۔ کوئی برف توڑ توڑ کر کھلا رہا ہے اور زیادہ تر لوگ بیگم کا ناطقہ بند کئے ہوئے ہیں کہ آخر ہوا کیا تھا اور وہ بیچاری ہیں کہ چور سی بن کر رہ گئی ہیں ہر ایک ان ہی کو قصوروار سمجھ رہا ہے کہ آخر تم نے ان سے ایسی فکر پیدا کرنے والی باتیں کیں ہی کیوں؟ وہ غریب ہر ایک کو سمجھا رہی ہیں اور کانا پھوسی ہو رہی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں انار ہے۔ تو کوئی سیب لئے کھڑا ہے کسی کو خس کا عطر سنگھانے کی سوجھی ہے تو کوئی سر سہلا رہا ہے پنکھا ہے کہ برابر جھلا جا رہا ہے۔ برف ہے کہ برابر کھلائی جا رہی ہے۔ شربت ہے کہ جتنا چاہیں ہم پئیں۔ یہاں تک کہ ہم کو سکون ہوا اور ہم آنکھیں بند کر کے چپکے لیٹ رہے ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ دن بھر کے تھکے ہوئے دفتر سے آئے ہیں ذرا دیر پنکھا جھلوا کر سو رہیں اور ہمارے تیمارداروں کی بھی یہی مرضی تھی کہ ہم کو نیند آ جائے۔ لہٰذا ان عشرتوں کے ساتھ ہم سو گئے اور گھر بھر میں ہماری نیند کے اہتمام کے لئے سناٹا کر دیا گیا۔ کوئی زور سے

نہ بولے۔ کوئی ایڑی سے نہ چلے۔ سب پنجوں کے بل چلیں۔ کسی برتن کو زور سے نہ رکھا جائے۔ کوئی دروازہ زیادہ آواز کے ساتھ بند نہ ہو اور کوئی مکھی ہم پہ نہ بیٹھے۔ مختصر یہ کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ ہماری نیند اچاٹ ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی نیند کسی کو میسر نہیں ہو سکتی تھی ہم سوئے اور جی بھر کر آرام کی نیند سوئے۔ اب جو دو گھنٹہ کے بعد سو کر اُٹھے تو بیگم کا طرزِ عمل ہی دوسرا تھا یا تو وہ اقتصادی مرثیہ پڑھ رہی تھیں یا ہم کو بیدار دیکھتے ہی نہایت شفقت سے بولیں:۔

"سو چکے آپ؟"

ہم نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "جی ہاں کیا بہت دیر سویا؟"

بیگم نے کہا "نہیں تو کوئی دو گھنٹے سوئے ہونگے آپ۔ اچھا اب کچھ کھائیے گا؟"

ہم نے تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا "کچھ دل نہیں چاہتا۔"

بیگم نے کہا "ایک آدھ سیب یا سنگترہ یا دیکھئے۔ میں نے آپ کے لئے چکوترے کے کچالو بنائے ہیں۔ انگور بھی رکھے ہیں۔"

ہم نے کہا "پیاس معلوم ہو رہی ہے۔"

بیگم نے مدارات سے کام لیتے ہوئے کہا "تو پھر آپ شربت پیجئے بتائیے نارنج کا شربت بناؤں یا صندل کا۔ یا کوئی بوتل کھلوا دوں۔"

ہم نے کہا "خالی پانی پلوا دیجیے۔ شربت کون پیئے"۔

بیگم نے کہا "اچھا تو پھر آپ لمنیڈ کی بوتل پی لیجیے"۔

ہم نے کہا "لائیے تو پھر یہی سہی"۔

لمنیڈ کی بوتل پی کر چکوترے کے کچالو کھائے اور اب گھر کا ہر شخص فرداً فرداً خیریت مزاج پوچھنے کے لئے آنے لگا۔ کسی نے تاش کھیلنے کا مشورہ دیا۔ تاکہ دل بہلے تو کسی نے یہ رائے دی کہ ہم دفتر سے ایک آدھ روز کی چھٹی لے لیں۔ کسی نے تفریح کیلئے جانے کو کہا۔ تو کسی نے کوئی ہنسی کا قصہ سنا کر دربار داری کے فرائض کو انجام دیا۔ گویا گراموفون لے کر بیٹھ گیا اور کسی نے حبش اور اٹلی کی جنگ چھیڑ دی۔ مختصر یہ کہ رات کو اس وقت تک ہمارا یہ دربار لگا رہا جب تک کہ سونے کا وقت نہیں آگیا اور آخر ہم اسی شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ بادشاہوں کی نیند سو گئے۔

اب چونکہ ہم کو اختلاج کا دورہ ہو چکا تھا لہٰذا ہمارے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دفتر سے تین روز کی رخصت حاصل کر لی جائے۔ بتائیے کہ کیا برے رہے ہم اس طرح۔ پھر گھر بھر یہ حال کہ اب چاہے کوئی مر بھی جائے مگر ہم کو اس کا غم اٹھانے کی زحمت کوئی نہیں دے سکتا۔ عزیز و اقربا کی اموات، بچوں کی بیماریاں، خاندانی حادثات اور بیرونی سانحات کی اطلاع بھی ہم کو نہیں ہو سکتی بلکہ وہ زبردست سنسر بیٹھتا ہے کہ مثلاً

صاحبزادے صاحب نے پتنگ کے عشق میں کوٹھے کے اوپر سے پھاند کر اقدام خودکشی کیا اور گھر بھر اس حادثہ کے ماتحت بدحواس ہو گیا۔ خود بیگم کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی اور گھر سے لے کر باہر تک ایک کہرام مچ گیا۔ ان حضرت کی مرہم پٹی ہوئی۔ غرضکہ سب کچھ ہو گیا مگر ہم کو اس کی خبر اس لئے نہیں ہو سکی کہ مبادا اختلاج کے ماتحت ہمارا دم نکل جائے اور صاحبزادے صاحب کا حادثہ ہمارے لئے موت کا پیغام بن جائے لیکن اگر انتہائی احتیاط کے باوجود ہم کو اس حادثہ کے متعلق کچھ علم ہو جائے اور ہم اس کے متعلق بیگم سے تصدیق کریں تو وہ اپنے وحشت ناک چہرہ کو زبردستی بشاش بنا کر۔ اپنے اضطراب کو اطمینان کے بہروپ میں پیش کر کے اپنی رونی صورت کو تبسم زا بنا کر یہ کہیں گی کہ :-

" کچھ بھی نہیں، وہ چبوترے پر سے گر پڑا اور ذرا سا ماتھا چھل گیا ہے "

سنسر اس کو کہتے ہیں کہ کوٹھے کا چبوترا بنا دیا اور سر پھٹ جانے کو ماتھے کا چھلنا ظاہر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس اطلاع کے بعد ہم کو اختلاج میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ورنہ اگر خدانخواستہ ہم کو اختلاج کا مرض نہ ہوتا تو یقین جانئے کہ اسی کوٹھے کو جو چبوترا ظاہر کیا گیا ہے۔ یہی بیگم صاحبہ مونٹ ایورسٹ ثابت کرتیں اور یہی سر کا پھٹنا جو ماتھے کا چھلنا بتایا گیا ہے سر کے دو حصوں میں

مساوی طور پر تقسیم ہو جاتا کہا جاتا اور پھر ہم اس اطمینان کے ساتھ چارپائی پر لیٹ کر انگور نہ کھاتے ہوتے بلکہ صاحبزادے کے مرگ ٹوٹنے کی سزا میں ہماری ٹانگیں اس طرح توڑی جا رہی ہوتیں کہ ایک پیر گھر میں ہوتا اور ایک ہسپتال میں۔ ایک طرف ڈاکٹر کے یہاں دوڑنے کا مشورہ دیا جاتا اور دوسری طرف دوا فروش کے یہاں جانے کا حکم۔

کبھی بیگم کو سمجھانا پڑتا اور کبھی مجروح بچے کو، وہ کہتیں کہ خدا ہی اس کو بچائے، اور ہم کو کہنا پڑتا کہ خواہ مخواہ وہم نہ کرو۔ خدا کے فضل سے وہ بالکل اچھا ہے۔ وہ کہتیں کہ خون اب تک جا رہی ہے اور ہم ان کو سمجھاتے کہ اس خون کا بہہ جانا ہی اچھا ہے۔ وہ پوچھتیں کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اور ہم کو ڈاکٹروں کی طرف سے فی البدیہہ خدا جانے کیا کیا تصنیف کرنا پڑتا۔ راتوں کو بچہ کی تکلیف کی وجہ سے ہم کو جاگنا بھی پڑتا۔ بیگم کہتیں کہ میں تیمار داری کرتے کرتے تھک گئی ہوں تو ہم کو ان کی تیمار داری شروع کرنا پڑتی۔ بیگم علاج کے سلسلہ میں روپیہ کی کمی کا رونا رو دیتیں۔ تو ہم کو روپیہ لانے کے لئے خدا جانے کس قدر مقدمہ سازش میں شریک ہونے کے متعلق عذر کرنا پڑتا۔ مختصر یہ کہ ایک آفت ہوتی، ایک مصیبت ہوتی، ایک قیامت ہوتی۔ مگر اب یہ معلوم ہوا ہے کہ چبوترے پر سے لڑکا گر پڑا ہے اور سر ذرا سا چھل گیا ہے۔ گویا کوئی بات ہی نہیں

ہوئی۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش۔ ہم نے بھی بحیثیت باپ کے مشورہ دے دیا کہ ذرا ٹیکا لگوا دینا ورنہ گرمی کا زمانہ ہے کہیں مواد نہ پڑ جائے۔

اسی قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں حادثات سے خدا ہم کو بچاتا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خواہ بیگم کے پاس کوڑی بھی نہ ہو اور تمام گھر کا کارخانہ قرض پر چل رہا ہو۔ مگر وہ بیچاری یہ نہیں کہہ سکتیں کہ خرچ کی تکلیف ہے ہماری تمام ضرورتیں تو خیر شاہانہ دریادلی کے ساتھ پوری ہوتی ہی ہیں۔ مگر ہماری ذات کے علاوہ گھر میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا علم ہم کو اس بادشاہ کی طرح بالکل نہیں ہوتا جس کی حکومت کا تمام انتظام وزرا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ محض شاہی کرتا ہے۔

اگر جناب ہم کو یہ مبارک مرض نہ ہوتا تو آپ جانتے ہیں کہ یہی ہماری ہمہ داں نیک بیوی جو بظاہر فرمانبرداری کا ایک نمونہ اور شوہر کی اطاعت کی ایک قابلِ تقلید مثال بنی ہوئی نظر آتی ہیں کیا کرتیں۔ ہمارا ناطقہ بند کر دیتیں اور ہماری زندگی اس حد تک وبال بنا دیتیں۔ کہ ہم ہر وقت خودکشی کی تدابیر پر غور کرتے۔ مگر دل سے دعا نکلتی ہے اس اختلاج کے لئے اس نے ہماری تمام مشکلیں آسان کر رکھی ہیں اور ہماری زندگی کو تلخیوں سے قطعاً غیر متعلق بنا کر ایک فردوسی زندگی بخش رکھی ہے۔ گویا وثیقہ مل رہا ہے کسی شاہی خاندان کے چشم و

چراغ کو۔

اب فرمائیے کہ آپ کے لئے اختلاج کا مرض پیدا ہونے کی دعا کی جائے؟ امتحاناً آپ فرضی طور پر اختلاج کے مریض بن کر دیکھئے کہ آپ کی کتنی آؤبھگت ہوتی ہے۔ گھر بھر کا نقشہ ہی بدل جائے تو اس خاکسار کو نہ کہئے گا۔

پرابلم

جس کا وطن غریب الوطنی ہو وہ اپنے کندھے پر اپنا مکان تلاش نہیں کرتا بلکہ خانہ بدوشی پر ایسا اتراتا ہے گویا اسی سے وطن کے تمام حقوق حاصل کر کے رہے گا۔ معلوم نہیں یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی ہے یا ہر انسان فطرتاً مگر غیر محسوس طریقہ پر انگریز ہوتا ہے۔ بہر صورت کچھ بھی ہو حال یہ ہے کہ اٹھائیس سال تک لکھنؤ میں مہمان رہے۔ وطن پردیس اور پردیس وطن بنتا رہا۔ بیگانگی یگانگت بن گئی۔ نام کے ساتھ تھانوی لکھ لکھ کر لکھنوی بنتے رہے۔ اسی مسافر خانہ میں پڑھے لکھے۔ اسی سرائے میں شادی بیاہ سے فارغ ہوئے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں بچوں کے باپ بنے

ہوگئے۔ اور یقین اُس وقت جبکہ لکھنؤ قریب قریب وطن بن چکا تھا۔ ازلی خانہ بدوشی نے پھر کروٹ لی پیروں کے سنیچر نے دشتِ غربت کی راہ لی اور اب جو آنکھ کھلی تو ہم لاہور میں تھے۔

لاہور آکر نیا دانہ نیا پانی نئے آدمی نئے جانور یہاں تک کہ ادب بھی نیا ملا مگر طے تھا کہ اس نئی نویلی غربت کو پُرانے بال بچوں کے ساتھ گھر بنا کر رہنا ہے۔ فکرِ آشیانہ کیجئے یا آرزوئے دولت خانہ مختصر یہ کہ سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک پردیسی اس قسم کے واقف کارانہ کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا نئے ہمدردوں اور پرانے دوستوں سے اس کارِ خیر میں امداد کی مہم لیکر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے جن بزرگِ محترم کے دروازہ پر دستک دی گئی ان سے مراسم کچھ ایسے ویسے نہ تھے ہم دونوں تو ہم دونوں ہمارے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی "اخاہ" کا نعرہ بلند کرکے لپٹ گئے۔ پہلے کرسیاں نکلیں۔ پھر شکنجبین کی بارش شروع ہوئی۔ پھر سگریٹ کی ژالہ باری ہوئی۔ مختصر یہ کہ عجیب خوشگوار ملاقات تھی۔ دل خوش ہوگیا، پردیس میں ایسے ہمدم دیرینہ کا ملنا واقعی مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ مکان تو مکان اس سے تو اگر ہم جان تک مانگیں تو یہ عذر نہیں کر سکتے ہوٹل میں ٹھہرنے ہی پر ایسے خفا ہوئے کہ بمشکل راضی ہو سکے۔ کہنے لگے "اچھا کھانا کل ساتھ کھاؤ"۔

عرض کیا "بھائی جان میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں، وہاں جان بن کر حاضر ہوا ہوں"

یہ کہہ کر تمام حالات سنا دیئے کہ اب مستقل طور پر یہیں رہنا ہے اور جب ٹیپ کا بند

عرض کیا کہ فوراً مکان دلوایئے ڈھونڈھ کر تو ایک دم رخِ روشن کی تمام روشنی غائب

دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے گویا ہمارے لئے عالمِ بالا میں مکان تلاش ہو

رہا ہے سیٹی بجاتے رہے گویا اپنے گنتے سے مکان کا پتہ پوچھیں گے۔ سر پہ ہاتھ

پھیرا۔ کچھ منہ ٹیڑھا کیا۔ ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر بڑے مفکرانہ انداز سے

بولے "مکان ؟"

عرض کیا "جی ہاں مکان۔ یہی جو مکان ہوتا ہے نا۔ رہنے سہنے کے لئے یعنی کرایہ

کا مکان۔ یہی پچاس ساٹھ کے کرایہ کا ہو۔"

اسی عالمِ جذب میں فرمایا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مکان

تو آجکل بڑا پرابلم ہے۔ بہر حال "

بٹیا بی سے عرض کیا "کیا بہر حال ؟"

ارشاد ہوا "مطلب یہ کہ غور کرونگا"

حیرت سے گزارش کی "غور کس بات پہ کروگے۔ یعنی یہ کہ مجھے مکان دلوانا چاہیئے

یا نہیں۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے مکان فوراً چاہیئے"

سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد فرمایا "بڑا پرابلم ہے صاحب بڑا پرابلم۔ بہر حال اور لوگوں سے بھی کہہ رکھو اور میں بھی کوشش کرتا ہوں۔"

ان حضرت کے وعدے میں ہم کو وعدہ کم اور اخلاق زیادہ نظر آرہا تھا۔ لہٰذا ہم نے واقعی دوسرے لوگوں سے بھی کہنے کی ایمانداری کے ساتھ نیت کر لی مگر مصیبت یہ تھی کہ پہلے لوگ ڈھونڈے جائیں پھر اُن سے کہو کہ مکان ڈھونڈھو مگر وہ جو مثل مشہور ہے "جوئندہ یابندہ" ایک تو ملے ہوٹل کے گائیڈ۔ یہ گرل گائیڈ قسم کے نہایت مستعد اور ہمدرد سے آدمی ہیں خصوصاً ہمارے ساتھ تو اسٹیشن پر اس اخلاق سے پیش آئے تھے کہ ان کا بس چلتا تو قلی کے بجائے خود ہی اسباب اُٹھا لیتے جب سے بیچارے برابر خیریت پوچھ لیا کرتے تھے اور خدمات لائقہ کا برابر تقاضا فرمایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے اُن سے عرض کر دیا کہ "بھائی صاحب سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ مکان دلوائیے کوئی۔"

پہلے تو وہ منہ کھول کر اس طرح رہ گئے گویا اس وقت ہم کو آنکھوں کے بجائے منہ سے گھور رہے ہیں۔ پھر بڑے تعجب سے بولے "مکان یعنی مکان آخر کیوں؟"

ہم نے اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا "بھئی رہنا ہے نا۔ تو اس لئے مکان چاہیئے ہے ہم کو۔"

کچھ ڈرے ہوئے انداز سے فرمایا "آخر آپ کو ہوٹل سے کیا شکایت ہے"؟

ہم نے سمجھ کر بڑے ندوہ سے کہا "او ہو' آپ غلط سمجھے، ہوٹل کی بات نہیں ہے مجھے اب مستقل طور پر لاہور میں رہنا ہے۔ بال بچوں کو بلانا ہے۔ اس لئے کرایہ کا مکان چاہتا ہوں"

گائڈ صاحب نے اب پھر سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے کہا "ہوں۔ ہوں تو گویا مکان۔ مگر صاحب مکان ہے ــــــ"

ہمارے دل نے باقی جملہ پورا کر دیا ــــ بڑا پرابلم ــــ"

گائڈ صاحب کہہ رہے تھے۔ مگر خیر یہ جلدی کا کام نہیں ہے۔ فی الحال آپ ہوٹل ہی میں رہیئے میں برابر مکان کی فکر رکھوں گا"

ظاہر ہے کہ ان حضرت نے محض اپنے ہوٹل کی وجہ سے یہ بات ٹالی تھی۔ ان کو ہمارے مکان سے زیادہ ہوٹل کی فکر ہونا چاہیئے۔ ان سے ہمارا مطالبہ ہی غلط تھا مگر اہلِ غرض اندھے تو ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ بیوقوف بھی ہونے کی سعی بلیغ فرماتے ہیں خیر یہی غنیمت ہے کہ اس حماقت کا اس قدر جلد احساس ہو گیا۔ چنانچہ اب کی مرتبہ ہم نے سمجھ بوجھ کر ایک ایسے شخص سے مکان کے متعلق کہا۔ جس کے انتخاب پر خود ہم کو ناز ہے۔ چشمہ لگا کر آنکھ کی کمزوری کا اعلان کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نظرِ

انتخاب بھی کمزور ہے۔ ہُوا یہ کہ گھر سے جوابی تار آیا تھا۔ اسی ہوٹل کے پتہ پر فوراً خیریت لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ تار والے کو کچھ نہ کچھ اس بات کا انعام دیا جاتا ہے کہ وہ کسی کے مرنے کا تار نہیں لایا۔ چنانچہ ہم نے بھی بزرگوں کی اس وضع کو قائم رکھا۔ تار والا تھا شریف آدمی، نہایت اخلاق سے" اس کی کیا ضرورت ہے صاحب جی" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ ہم نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ یہ تو خیر یوں ہی ہے البتہ اگر مکان دلواؤ کہیں سے ہم کو تو البتہ انعام دیں گے۔ اس نے چشمہ کی اوٹ سے ہم کو اس طرح دیکھا گویا ہمارے متعلق یہ غور کر رہا ہے کہ اس شخص کے متعلق مکان میں رہنا ٹھیک کہا جا سکتا ہے یا پنجرہ میں رہنا اور تفصیلی طور پر غور کرنے کے بعد تار کی زبان میں ارشاد فرمایا" مکان۔ اچھا جی" تار کی عبارت غیر متعلق لوگ ذرا کم سمجھتے ہیں مگر ہم ٹھہرے اہلِ معاملہ فوراً سمجھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ بے چارہ سلام کر کے رخصت ہُوا اور ہم پھر ان لوگوں کی تلاش میں نکل گئے جن کے متعلق مکان کی تلاش کے سلسلہ میں ذرا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ تفصیلات سے نہ آپ کو دلچسپی ہو گی نہ میں اپنی نجی باتیں بتانے کا شوقین ہوں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ایک لسّی والے سے مکان کے لئے کہا اور محض یہ کہنے کیلئے لسّی کا ایک گلاس پینا پڑا۔ ایک ہیر کٹنگ سیلون میں تفصیلات سے مکان کی اپیل کرنے کے لئے

بال نبوا ڈالے - ایک تانگہ والے کے چہرے پر "ٹو لیٹ" کا سائن بورڈ نظر آیا لہٰذا ایک گھنٹہ کا کرایہ اُس کو دے دیا۔ ایک دن - دو دن - تین دن یہاں تک کہ اسی جستجو میں صبح ہونے لگی اور شام ہونے لگی مگر مکان نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ ملی ملائی اچھی خاصی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگنے کی ٹھانی۔ اپنے آقائے نامدار سے بھی مکان کی مشکل کے مقابلہ میں ملازمت سے دست برداری کے آسان ہونے کا اظہار کر دیا۔ مگر اس سلسلہ میں اس کثرت سے "پرابلم" کا لفظ سنا ہے کہ اب تو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پنجابی زبان میں انگریزی کے اس لفظ کے معنی مکان ہی کے تو نہیں ہیں۔

جستجو پر ایک وقت وہ بھی گزرتا ہے جب جستجو کرنے والا تھک کر بیٹھ رہے اور منزل خود اُسے ڈھونڈنے نکلے۔ چنانچہ ہم اس کمال کو بھی آخر پہنچ ہی گئے۔ گھر خط لکھ دیا کہ نوکری مل گئی ہے مگر تم سب کو چھوڑنا پڑیگا۔ اس لئے کہ مکان نہیں ملتا۔ ارادہ کر لیا کہ کسی ہوٹل ہی کو اپنا یتیم خانہ بنائیں گے۔ ایک ہوٹل سے بات چیت بھی کر لی۔ اب خدا کی دین ملاحظہ ہو کہ مکان ملنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے گاندھ صاحب نے ایک مکان کا مژدہ سنایا۔ ہم نے بے اختیار۔ ان کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے عرض کیا کہ یوں نہیں جناب پہلے آپ یہ کہیئے کہ کل صبح چائے میرے ساتھ

نوش فرمایئے۔ اس کے بعد ہم دونوں چلیں گے مکان دیکھنے۔ وہ فرشتۂ رحمت تو تھے ہی ہماری محبت کو بھلا کیسے ٹھکراتے۔ وعدہ کر کے چلے گئے۔ لاہور آنے کے بعد آج پہلی مرتبہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس پردیس نے اتنے دنوں کے بعد ہمارا انسان ہونا تسلیم کیا ہے۔ سر سے ایک بار اتر چکا تھا۔ پہلے مکان کے متعلق سوچا کرتے تھے اب اس کی آرائش کے پُر لطف خواب دیکھنے لگے۔ ایک کمرہ بنائیں گے اسٹڈی کا۔ اس میں لکھنے کی میز پہ کوئی فضول سامان نہ ہو۔ البتہ ایک بڑا اسا شیشہ ضرور ہوگا۔ سونے کا کمرہ ذرا ارمان انگیز ہونا چاہیئے۔ کہ آدمی جاگے تو بھی خواب سا دیکھتا رہے یا خواب دیکھے تو قبر وغیرہ کے نہیں بلکہ ذرا اچھے قسم کے۔ اسی طرح ہر کمرہ کا ایک تصور آنکھوں کے سامنے تھا دل تو خوش تھا ہی طے کیا کہ چلو آج بچھرس چلیں شاید ڈرائنگ روم کا کوئی نیا سیٹنگ نظر آجائے۔ کپڑے پہن پہن کر گنگنانے لگے :۔

اک بنگلہ بنے نیارا

ہوٹل سے برآمد ہوتے ہی۔ وہی تانگے والا لپک کر سامنے آگیا۔ "واہ بابوجی ایک مکان آپ کے لئے ڈھونڈا ہے تو اب آپ نہیں ملتے۔ کل کسی وقت دیکھ لیجئے"

ہم نے سوچا کہ دیکھیں مکان یا نہ دیکھیں۔ گائڈ صاحب کو اگر خبر ہو گئی کہ یہ اغیار کے ساتھ مکان دیکھنے گیا تو بُرا نہ مان جائیں۔ مگر اس بیچارے نے بھی محبّت ہی سے ہمارا خیال رکھا ہے لہٰذا کیا مضائقہ ہے اگر ہم چپکے سے مکان دیکھ آئیں۔ کچھ غور کرنے کے بعد کہا "کل نہیں اس وقت چلو تو چل سکتے ہیں کل ہم کو اور مکانات دیکھنا ہیں" دل غنی ہو تو مکان کو آدمی مکانات کہنے لگتا ہے۔ یہ قواعدِ واحد و جمع کی غلطی نہیں جذبات کی گمراہ ناشناسی ہے۔ تانگہ والا تیار ہو گیا۔ اور ہم اس کے تانگہ پہ روانہ ہوتے۔ چلا چل۔ چلا چل۔ شہر کے تمام محلّے ایک ایک کر کے رُخصت ہو گئے۔ یہاں تک کہ لاہور کی تمام آبادیاں ختم ہو گئیں۔ مگر ہمارے مجوّزہ دولت خانہ کا کہیں پتہ نہیں۔ تانگہ ہے کہ چل رہا ہے۔ اور ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اس سے پوچھیں تو سہی کہ آخر ارادہ کیا ہے۔ مگر پھر خود ہی اپنے اس ارادے پہ شرما کر رہ گئے۔ کہ اس بیچارے نے تو ہماری محبّت میں اتنی دُور تک خاک چھان کر ہمارے لئے مکان ڈھونڈا ہے، اور ہم اس کے جذبہ کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ ذرا سے فاصلہ ہی کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ غالباً اس غریب کو "پرابلم" کہنا نہ آتا تھا۔ لہٰذا وہ بخطِ مستقیم چلا جا رہا تھا۔ لاہور میں اس کو مکان نہ مل سکا تو اس نے کسی اور شہر میں سہی، بہر حال مکان ڈھونڈھ دیا۔

آخر خدا خدا کر کے اب اس نے سڑکوں کو چھوڑ کر گلیاں دریافت کیں۔ ایک گلی سے دوسری میں، دوسری سے تیسری میں، اور تیسری سے چوتھی میں جا کر ایک جگہ تانگہ روک کر کہا "یہ ہے سامنے والا مکان"۔

ہم نے چاروں طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا "کون سا مکان؟"

اطمینان سے کہنے لگا "وہ جو ٹاٹ کا پردہ سامنے پڑا ہے نا بس اسی کے اندر ایک طرف کو مکان ہے"۔

ہم نے اس ٹاٹ کے پردے کو دیکھا جو ایک آبنائے پر اس طرح پڑا ہوا تھا گویا جہاز ڈوب چکا ہے صرف اس کا پھریرا باقی رہ گیا ہے۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ اور یہاں ہیرا کی سے قطعاً ناواقف۔ مرتے کھپتے۔ دیوار سے چپکے ہوئے اس ٹاٹ کے پردے تک پہنچے اور اندر جو جھانک کر دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مالکہ مکان ایک بڑی بی اپنی مکھری سے کان میں کچھ باتیں کر رہی تھیں تاکہ ان کی مرغیاں نہ سننے پائیں۔ ہم کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا اور مکان دیکھنے کی غرض معلوم کرنے کے بعد بولیں:۔

"یہی ہے بیٹا مکان دیکھ لو۔ میرا کیا ہے میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی"۔

وہاں سے جو بھاگے ہیں تو ہوٹل کے پاس پہنچ کر اس وقت ہوش بجا ہوئے جب تانگہ والے کو ساڑھے تین روپے مکان کی رونمائی کے سلسلے میں دینا پڑے مگر اطمینان تھا کہ یہ مکان تو تفریحاً دیکھا ہے۔ اصل میں تو صبح دیکھیں گے مکان گائڈ صاحب کے ساتھ۔

صبح گائڈ صاحب نے چاء پی کر حبِ المکلّف الخدمت کو رہینِ منت فرمالیا تو مکان دکھانے سے چلے یہ مکان یقیناً کسی زمانے میں مکان تھا۔ غالباً نانا فرنولیس کے زمانہ میں اس کی پہلی مرتبہ مرمّت ہوئی تھی۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس مکان میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو بلا وجہ اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے، گائڈ صاحب نے نام کے ساتھ "تھانوی" دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جا سکتا تھا۔ ہر کمرے کا فرش البتہ کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کر دیجئے، چاہے پھول دار چمن بنا لیجئے۔ مختصر یہ کہ

ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائڈ صاحب کا مُنہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ وہ بھی عجیب آثار قدیمہ بنے ہوئے کھڑے تھے۔ طُرّہ یہ کہ ہم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"کیا رائے ہے؟"

ہم نے کہا: "مکان کے متعلق تو بعد میں عرض کرونگا۔ پہلے تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق۔"

صاف گوئی تو دیکھئے کہنے لگے "آپ اچھے رہیں گے اس میں۔"

ہم اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس مکان سے نکل آئے اور اس کے بعد سے گائڈ صاحب کی صورت سے وہ نفرت ہوئی ہے کہ اگر مکان فوراً مل نہ جاتا تو عدم تشدد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جیل میں رہنے کا انتظام ہو ہی جاتا۔ مگر شکر ہے کہ سب سے پہلے دوست نے آخر ایک جگہ تلاش کر دی اور ہم سے دوستی کے نام پر اپیل کی کہ ہم اس جگہ کو مکان سمجھیں۔ اس میں کمرے بھی ہیں، دروازے بھی، چھت بھی ہے اور غسل خانے بھی۔ کوٹھریاں بھی ہیں اور باورچی خانے بھی مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کو مکان نہیں کہا جا سکتا البتہ کہئیے تو ہم "کہہ دیا کریں۔

اب سنیئے دیگر پرابلموں کی ریل پیل :-

" مکان تو مل گیا ہے اب ملازم دلوائیے "

" جی کیا کہا ۔ ملازم ؟ ملازم تو بڑا پرابلم ہے "

" مکان اور نوکر تو آپ کی دعا سے مل گئے ہیں البتہ ضرورت کی بعض چیزیں نہیں ملتیں ۔ مثلاً گھی "

" گھی —— ؟ گھی تو بڑا پرابلم ہے "

" اچھا صاحب ڈالڈا سہی ۔ ہم بناسپتی پر گزر کر لیں گے ۔ مگر شکر "

" شکر ۔ یعنی چینی چاہیئے ہے آپ کو —— صاحب چینی تو بڑا پرابلم ہے "

میں نے کہا " السلام علیکم ۔ چینی کے لئے میں نے کارڈ حاصل کر لئے ہیں البتہ کوئلہ یا لکڑی کہیں سے دلوائیے "

" خدا جانتا ہے اسی فکر میں ابھی نکلا ہوں یہ ایندھن کا معاملہ بڑا پرابلم ہے "

مختصر یہ کہ لاحول ولا قوۃ جو چیز ہے پرابلم ۔ جو بات ہے پرابلم تعلیم اسی پرابلم کے نہ یاد ہونے کی وجہ سے چھوڑی اب لاہور بھی یہ پرابلم چھوڑوائے گا مصیبت

تو اس پرابلم کمبخت میں یہ ہے کہ حل ہو جائے تو پرابلم نہ حل ہو تو پرابلم۔ پہلے تو صبر کر لیا تھا کہ شاید صرف مکان کو پنجابی میں پرابلم کہتے ہیں مگر اب تو معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب ہی کو پرابلم کہنا پڑے گا جہاں ان پرابلموں کے مارے ہم خود ہی حل ہوئے جاتے ہیں ۞

قاضی جی

(دروازہ پر دستک)

اجمل :- جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں :-

بیوی :- کون اجمل بھائی؟ میں آرہی ہوں دروازہ کھولنے :-

اجمل :- (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض بھابی۔ کہئیے کیسے یاد فرمایا تھا اور ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟

بیوی :- کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں ان کو سمجھاؤں کس طرح۔ اب یہ دھن سوار ہوئی ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ ہو جائے :-

اجمل: "فلم کمپنی پر قبضہ؟ اُن کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دُم کدھر"

بیوی: "یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر میں مشکل سے دو تین تماشے دیکھے ہوں گے مگر دعویٰ یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل گئی تو جیسے دُنیا ہی تو اُلٹ دینگے"

اجمل: "مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟"

بیوی: "اللہ جانے فلم کمپنی نگوڑ ماڑی کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے تھے۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لیکر چھوڑونگا۔ خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں"

اجمل: "اور تشریف کہاں لے گئے ہیں"

بیوی: "جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آجائے"

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی: "آہا۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو نہایت ضروری مشورے کرنا ہیں۔ بلکہ اب یہ طے ہے کہ یا تو ہم دونوں بن گئے ورنہ جہاں ستیاناس وہاں ساڑھے ستیاناس سہی مگر دوست پھڑک اُٹھو گے

وہ ترکیب تمہارے اس ہیمیدان کے ذہن میں آئی ہے۔ قسم خدا کی سونے کی کان سمجھو سونے کی کان۔"

اجمل: "اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے۔"

بیوی: "غلم کمپنی کھل رہی ہے۔"

قاضی جی: "کھل رہی ہے بابا یہ سمجھو کہ بس کھل گئی۔ ذرا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ مٹی سے سونا بنالو۔ دیکھ لینا یہ ولدر دھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے۔ موٹریں اُڑاتے پھرو گے موٹریں۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل بھائی کہ زندگی گویا میں نے برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چکے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔"

اجمل: "یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ سے اور غلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ؟"

قاضی جی: "بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیزمن بہت سی صلاحیتیں انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اُس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جوتیاں چٹخارتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا کہ

ہیں دراصل تھا ہی اس کام کے لئے آپ کو حیرت ہو گی کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا

کام میں نے کر لیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم "

اجمل " یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے۔ اور کہانی وغیرہ "

قاضی جی " میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہو گی۔ اے صاحب مجھ کو خود

یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آ

رہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہو گا۔ استغفراللہ "

اجمل " استغفراللہ ؟ "

قاضی جی " نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رُخِ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں

کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وُہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں

گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں جنجد ہوں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اے صاحب

اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر

اب تو ان کو بخدا فخر کرنا چاہیئے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا اِن

کا شوہر ہے "

بیوی " میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں کیا لکھا گیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے

ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لئے

کہانی لکھی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہوگئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

"قاضی جی"۔ ملاحظہ فرمائیے آپ کی حماقت، خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو مگر جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دیں گے اُس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی یا اِس نامعقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق"۔

اجمل"۔ اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے"۔

قاضی جی"۔ یہی تو خوبی ہے اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اِس طرح شروع کی ہے کہ ایک ربڑ ٹائر تانگہ ہے جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اُس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ تانگہ نہایت تیزی سے ایک سنسان سڑک سے گذر رہا ہے اور تانگے والا گاتا جا رہا ہے سے

لمبی چوڑی سڑکوں پر۔ ہاں پر۔ ہاں پر۔ میرا تانگہ فرفر جائے

میرا تانگہ فرفر جائے میرا گھوڑا ہنٹر کھائے

دُم لہرائے چال دکھلائے

لمبی چوڑی سڑکوں پر۔ ہاں پر۔ ہاں پر۔ میرا تانگہ فرفر جائے

بھولی سی ہلکی ہلکی سواری ہیں وادی

بیوی۔ "(ہنس کر) بھئی اللہ۔ بس خدا ہی تم پر رحم کرے۔"

قاضی جی۔ "لاحول ولا قوۃ۔ اگر اسی طرح سنوگی تو میں سُنا چکا۔ سمجھنے کی تمیز ہے نہیں اور بھئی اللہ اور اوئی اللہ شروع کر دیا۔ تم کیا جانو کہ فلم کے گانے اسی طرح ہوتے ہیں۔ یہی گانا جب سازوں کے ساتھ چلتی ہوئی دھن کی شکل میں آئیگا تو دیکھیئے گا کہ کیا قیامت ہوتا ہے۔"

اجمل۔ "بھابی خدا اُس لینے دیجئے مجھے تو بیحد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج ہی مجھ پر روشن ہوئے ہیں۔"

قاضی جی۔ "اے صاحب ابھی آپ نے سُنا ہی کیا ہے۔ دم بخود رہ جاؤ گے آگے سُن کر۔ خیر گانوں کو جانے دو ان کا لطف تو سازوں ہی پر آئے گا۔ مگر کہانی سنو کہ کس قیامت کی ہے۔ تو صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا ہوا جا رہا ہے کہ ایک موڑ پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری نکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قیامت کا حسن ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اُس کو اسی بے ہوشی کی حالت میں موٹر پر ڈال کر چل دیتا ہے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں لے آتا ہے اور تیمار داری کرتا ہے وہاں

صاحب ایک واقعہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کو ہوش آجاتا ہے۔"

بیوی"۔ (ہنس کر) لو اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے۔"

قاضی جی"۔ خیر۔ خیر۔ تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے، مگر خدا کے لئے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو یہ بڑا پُر لطف موقع ہے تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے۔ میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے۔ الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے۔ جو کچھ بھی سمجھیں جناب۔ وہ کہتی ہے۔ میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا۔"

بیوی"۔ تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت۔"

قاضی جی"۔ لیجئے یہ ہوئی ہے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہو گا۔ مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کہا یعنی بھینس بولی۔ گویا بھینس نے کوئی مہمل سا جواب دیدیا۔ خیر تم سے تو مجھ کو اسی قسم کی توقع تھی۔ مگر ان میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری کے ساتھ کہدیں کہ کس قیامت کی روانی ہے۔ اس قدر تالیاں بجیں گی اس مکالمہ

یہ کہ تم ہی صدقہ اتار دو گی مجھ پر سے کہ خدا مجھ کو نظرِ بد سے بچائے رکھے۔"

اجمل "یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو نہ تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ ہیں گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی ان ہی دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی ایسا کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔"

قاضی جی "نہ سہی۔ ایسے بھی نہیں کیا ہے تو نہ سہی۔ اب کریں گے اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو کہ دنیا منہ دیکھ کر رہ جائے گی اور فرض کر لو کہ نصیبِ دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔"

بیوی "ہاں اور کیا تمہارے لئے تو ایک تماشہ ہو گیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔"

قاضی جی "لیجئے لے آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا۔ مگر معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان

پاکستان نہ ہؤا جناب کا تکیہ کلام ہوگیا۔ اور اگر پاکستان کو آپ میرے لئے کوئی ڈھونس سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سُن لیجیے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں۔ پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے"۔

اجمل :۔ "پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپنے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں"۔

قاضی جی :۔ "فرمایئے۔ فرمایئے۔ آپکے لئے تو ضروری ہے۔ کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں۔ اس فرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں۔ بہرحال آپ کو جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمایئے سے میں سُننے کے لئے پیدا ہؤا ہوں ــــــ وہ۔ وہ۔ ہائے ہائے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آرہا ہے۔

اجمل :۔ "قاضی جی بھابی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی آپکے بس کا روگ نہیں ہے آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے۔ تو ایسا کام کیجیے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہو"۔

بیوی جی :۔ "اور کیا۔ کرنا ہی چاہیئے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو"۔

قاضی جی :۔ "خدا کے لئے کبھی تو مجھ نامراد سے اس طرح باتیں کیا کرو جس سے مجھ کو

یقین آئے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں تمہاری زبان سے ملک اور قوم قسم کے الفاظ سنکر۔ اے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں۔ میری رفیقۂ حیات ہیں۔ میری شریکِ غم ہیں مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کرتی ہیں وہ نہایت مہمل۔ جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ تھانیداری کی ہے زندگی بھر اب بتائیے میں تھانیداری کیسے کر سکتا ہوں"۔

بیوی "اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کیوں نہیں کرتے"۔

قاضی جی "ڈاکٹری (قہقہہ لگا کر) لیجئے کیا عقل کی پوٹ بیوی ملی ہے ہم کو بھی۔ یعنی میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔ جس کو یہ تمیز نہ ہو کہ نبض انسان کی گدی میں ہوتی ہے یا بغل میں اس کو جناب ڈاکٹری کا مشورہ دے رہی ہیں"۔

بیوی "بس ٹھیک ہے اسی طرح تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فلم کس چڑیا کا نام ہے۔ پھر آخر فلم کمپنی کے پیچھے کیوں پڑے ہو"۔

قاضی جی "یہ تو صاحب قائل کرنے کا نہایت ہی بیہودہ طریقہ ہے۔ کہ مثالیں دیکر قائل کیا جائے۔ مگر تم خود ہی دیکھ لو کہ آخر میں نے کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ گانے تیار کئے ہیں یا نہیں"۔

بیوی :۔ خدا کے لئے یہ کہانی یا یہ گانے کسی کو سنانا بھی نہیں لوگ مذاق اڑائیں گے ۔"

قاضی جی :۔ کیا مطلب یعنی اس قدر لغو ہیں اس قدر مہمل ہیں ۔ جب تم اپنی حقیقی ۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خاص اپنی بیوی ہو کر ایسی باتیں کہہ رہی ہو تو مجھ کو کسی اور سے کیا شکایت ہو سکتی ہے ۔ وہی سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی اپنے ہاتھ ——— نہ ——— نہ ——— وہ تو فارسی میں ہے کہ سعدی از دستِ خویشتن فریاد ۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے ۔ میرا کیا ہے لعنت بھیجو فلم کمپنی پر ۔ آج سے اگر کسی فائدے کی بات کا ذکر بھی کردوں تو تُھو ہے میری اوقات پر ۔"

(غصہ میں چلے جاتے ہیں)

منشی جی

(منشی جی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں کچھ
ہانپ رہے ہیں گویا دوڑتے ہوئے آئے ہوں اور
بیوی کو آواز دیتے ہیں۔)

منشی جی: "میں نے کہا سنتی ہو اجی کہاں گئیں؟ لاحول ولاقوۃ ہمیشہ کام کے وقت ندارد۔"

بیوی: "آ تو رہی ہوں۔ تم تو گھبرا دیتے ہو ابھی گری ہوتی موئے دوپٹے میں اُلجھ کے۔"

منشی جی: "اجی میں نے کہا وہ آیا ہے تصویر والا۔ تصویر کھینچنے والا۔ اُس کے ڈبہ پہ لکھا ہوا ہے...... اُونہہ...... کچھ بھلی سی بات لکھی ہوئی ہے۔ لاحول ولاقوۃ کبھی جو یاد آجائے۔"

بیوی ”تو مطلب کیا ہے تمہارا۔ کھنچوالو نا تصویر۔ کیا اچھے معلوم ہوں گے بیچارے
اس بڑھاپے میں تصویر کھنچواتے ہوئے“
منشی جی ”کیا مطلب اس کا یعنی بڑھاپے میں تصویر ہی نہیں کھنچوائی جاتی۔ تمہاری
اسی بات کا کچھ جواب اس تصویر کھینچنے کے ڈبّہ پہ لکھا ہوا ہے۔ ذرا تم جھانک کے
دیکھو تو باہر“
بیوی ”میں کیا کہہ دوں گی دیکھ کر تم کو تصویر کھنچوانا ہے تو کھنچوالو نا میرا سر کیوں
کھا رہے ہو“
منشی جی ”میرا مطلب یہ تھا کہ تم بھی کھنچوالیتیں تصویر“
بیوی ”لو اور سنو میں تصویر کھنچواؤں گی؟“
منشی جی ”تم بیٹھنا کرسی پر اور میں پیچھے کھڑا ہو جاؤں گا معلوم ہوگا جیسے میاں بیوی
ہیں ہم تم“
بیوی ”خیر آپ مجھے تو معاف کیجئے اپنی ہی تصویر کھنچوالیجئے۔ خدا نہ کرے کہ میں
اس بڑھاپے میں ایسی سٹھیا جاؤں کہ موئی تصویر کھنچواتی پھروں“
منشی جی ”سمیرا کیا ہے میں نے تمہاری ہی بھلائی کے لئے کہا تھا کہ تمہاری بھی یادگار
رہ جاتی...... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہی لکھا ہے اس ڈبّہ پہ کہ... کہ...“

لو پھر بھول گیا۔ تم تو آئے حواس کھو دیتی ہو اپنی کج بحثی ہیں..... ذرا پردہ سے جھانک کر دیکھ لو بہت موٹا موٹا لکھا ہؤا ہے "۔

بیوی "توبہ ہے، سچ مچ ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو چلو اب پردہ سے بھی جھانکوں گی۔ مگر پڑھنا تو پھر بھی تم ہی کو پڑیگا "۔

منشی جی "پڑھ تو خیر میں دونگا مگر یہ تو تم کو معلوم ہو جائیگا کچھ لکھا ہؤا ہے (دونوں جانتے ہیں ہگبہ باتیں کرنے جانتے ہیں) میں نے کہا تھا کہ تصویریں آج کھنچ جاتی۔ وہ دیکھو سفید سفید لکھا ہے نا "۔

بیوی "ہاں دیکھ لیا لکھا ہے کچھ "۔

منشی جی "لکھا ہے کہ "انسان کی..... اصل یادگار..... کیا ہے؟.... تصویر۔ سمجھیں کچھ۔ میں تو بس یادگار کے لئے کھنچوانا چاہتا ہوں اپنی اور تمہاری تصویر "۔

بیوی "اپنی یادگار کے لئے کھنچواؤ مگر میری موئی یادگار کیا ہو گی؟"

منشی جی "یادگار کیا ہو گی؟ بھئی سخت جاہل ہو۔ خیر جاہل تک تو غنیمت تھا مگر بیوقوف بھی ہو، ائے صاحب یادگار کے معنی یہ ہیں کہ اگر والد صاحب کی تصویر میرے پاس نہ ہوتی تو بھلا میں ان کو یاد رکھ سکتا تھا؟ قیامت تک

تو یاد نہ رکھتا۔ والدہ صاحبہ کی تصویر نہیں ہے تو یقین جانو کہ کس مرقعہ کو یہ بھی یاد ہو کہ ان کی صورت کیسی تھی۔"

بیوی "اور صورت یاد ہی رہتی تو تم کیا کر لیتے ؟

منشی جی "کیا کر لیتے ؟ یہ کیا بات ہوئی ؟ ارے صاحب خوش ہوتے دیکھ دیکھ کر۔ اب والد صاحب کی تصویر دیکھ کر کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے والد صاحب بھی تھے۔"

بیوی "اے جب انسان ہی کو دنیا میں رہنا نہیں ہے تو تصویر موئی رہ کر کیا کرے گی ؟"

منشی جی "لاحول ولا قوۃ۔ وہ تصویر والا باہر کھڑا ہوا سوکھ رہا ہے اور تم بحث کر رہی ہو مجھ سے عزیز من۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔ یعنی بیگم صاحب اگر انسان کو دنیا میں رہنا ہی ہوتا تو تصویر کی کیا ضرورت تھی ؟ مگر تصویر تو اسی لئے ضروری ہے کہ انسان کو رہنا نہیں ہے یہاں تمہاری قسم ایسی بات کہدی ہے یہ میں نے کہ اب تم کو چپ ہو جانا چاہیئے۔ ایں ؟"

بیوی "تو میں کچھ کہہ بھی رہی ہوں تم کو کس نے روکا ہے البتہ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں تصویر نہیں کھنچواؤں گی"

منشی جی "شبن جب میری عمر کو پہنچے گا تو میری تصویر دیکھ دیکھ کر کیسا خوش ہوگا کہ

بھئی کیا والد نے ہمارے بھی اور تم کو یاد بھی نہیں رکھے گا۔ میرا کیا ہے"۔

بیوی:" اس موئی بڑھاپے کی جھریوں دار ڈراؤنی صورت کو یاد رکھنے سے نہ یاد رکھنا ہی اچھا ہے تم کو شوق چرایا ہے، تم کھنچواؤ"۔

منشی جی:" اچھا بھائی اب کون تم سے بحث کرے مگر میں تو کھنچواؤں گا۔ ذرا منہ ہاتھ دھونے کا پانی صابن، منجن، آئینہ، کنگھی سرمہ وغیرہ تو رکھ دو"۔

بیوی:" شرم تو نہیں آتی بڑھاپے میں یہ سولہ سنگار کر کے تصویر کھنچواتے ہوئے جیسے بیچارے اپنے سسرال ہی تو بھیج رہے ہیں"۔

منشی جی:" خیر خیر۔ یہ وقت مذاق کا نہیں ہے کہیں وہ انتظار کرتے کرتے باہر ہی سے چل نہ دے ذرا میں اس سے کہہ دوں۔ تم پانی وانی رکھ دو پھر ذرا میرے کپڑے نکال دو۔ (جاتے ہوئے) وہ جامہ دار کی اچکن ہے نا۔ اور میرا نیا جوتا۔ (دروازہ کھول کر) بھائی ذرا ٹھہر جانا میں بس تیار ہی ہو رہا ہوں"۔

تصویر والا:" (دور کی آواز) جلدی کیجئے صاحب دھوپ جا رہی ہے۔ پھر وقت نہیں رہیگا"۔

منشی جی:" (واپس آتے ہوئے) ابھی لو...... ابھی لو...... (بیوی کے پاس آکر) ایں، یعنی بیٹھی ہوئی ہو وہ کہہ رہا ہے کہ دھوپ جا رہی ہے۔ اور تم ہو

کہ بیٹھی ہو؟"

بیوی "تم جب تک مُنہ دھو لو اور وہ اچکن کونسی کہی تھی؟"

منشی جی "تو یہ ہے ارے صاحب وہی شادی والی اچکن جامہ دار کی اور نیا جُوتا۔ لاؤ یہ لوٹا اِدھر کھسکا دو۔ یہ رہا منجن اور وہ کدھر گیا۔۔۔۔ وہی۔۔۔۔ ارے صاحب۔ وہ وہ۔۔۔۔ صابن دان"

بیوی "سامنے رکھا ہے اور دکھائی نہیں دیتا۔ اور کچھ چاہیئے ہے کہ میں جاؤں بس کپڑے نکالنے"

منشی جی "نہیں بس تم کپڑے لا دو جلدی سے۔ شاباش!"

(بیوی جاتی ہے۔ منشی جی مُنہ دھوتے ہیں مُنہ دھونے کی آواز کے ساتھ ہی منشی جی بڑی زور سے کہتے ہیں۔)

منشی جی "لاحول ولا قوۃ۔ اَخ تھو۔۔۔۔۔۔۔۔ تھو۔۔۔۔۔۔۔ تھو۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ"

(بیوی دوڑی ہوئی آتی ہیں۔ منشی جی برابر تھوک رہے ہیں۔)

بیوی: "کیا ہے آخر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیا ہوا؟"

منشی جی: "اَخ تھو ۔ ۔ ۔ ۔ ہوا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ اخ تھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی کا کام شیطان کا

منجن کے بجائے صابن لگا لیا دانتوں پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھو ۔ ۔ ۔ اَخ تھو۔"

بیوی: "(ہنسی سے دوہری ہو کر) منجن سے منہ دھو لو نا اب اور اسی طرح

تصویر کھنچوا لو۔"

منشی جی: "اب مذاق ہی کرو گی یا آئینہ کنگھا بھی دو گی مجھے؟"

بیوی: "رکھا تو ہے آئینہ کنگھا دیکھا بھی تو کرو۔"

منشی جی: "ٹھیک ہے۔ اب ذرا ازار بند تو ڈال دو پاجامہ میں۔ بھئی خط بہت بڑھا

ہوا ہے اب کیا ہو؟"

بیوی: "اب میں اس کا کیا جواب دوں میرے ہاتھ کا کام تو یہ ہے نہیں کہ میں خط

بھی بنا دوں؟"

منشی جی: "خیر ہو گا بھی۔ ذرا سا گوند تو نہیں ہے گھر میں؟"

بیوی: "گوند؟۔ گوند کیا ہو گا آخر؟"

منشی جی: "ارے صاحب ہو تو بتا دو۔ تم تو جرح کرنے لگتی ہو بات بات پر۔ مطلب یہ کہ

ذرا مونچھوں پر تاؤ دینا تو تصویر رعب دار ہو جاتی۔"

بیوی :" تو گوند سے موئی مونچھیں چپکائی جائیں گی؟ لائیے دیتی ہوں میں گوند بھی "

(بیوی جاتی ہے)

منشی جی :" دیکھا پاجامہ لائی ہیں یہ نکال کر پھٹا ہوا نیفے کے پاس سے......

ارے صاحب اب آ بھی چکو "

بیوی :" آ تو رہی ہوں۔ ہاتھ پیر پھلائے دیتے ہو۔ خود ہی تو کہا تھا گوند لانے کو

نگوڑ مارا "

منشی جی :" یہ پاجامہ ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے یہ پھٹا ہوا چیتھڑا پہن کر کھنچے گی

میری تصویر "

بیوی :" اے ہے میں نے دیکھا بھی نہیں تو اس کا کیا ہے یہ تو کرتے اور اچکن کے

نیچے رہے گا "

منشی جی :" نیچے رہے گا؟ ارے صاحب نیفہ کے پاس سے پھٹا ہوا ہے نیفہ کے

پاس سے "

بیوی :" تو کیا نیفہ گھٹنوں پر رہتا ہے تمہارے یہاں؟ "

منشی جی :" (قائل ہونے کے انداز سے) ٹھیک ہے یہ تو اوپر ہی رہیگا۔ اچھا لاؤ وہ گوند

ہاں یہ بس اب ٹھیک ہے۔ مطلب یہ کہ تصویر کھنچوائی جائے تو ذرا ڈھنگ کی تو ہو۔ "

بیوی ! "ہائے ہے کیسی ڈراؤنی ہوگئیں موئی مونچھیں، معلوم ہوتا ہے جیسے چوہا دُم اُٹھائے ہوئے مُنہ پر بیٹھا ہے"

منشی جی "ایں ..... ہاں واقعی ..... ذرا قینچی نکالنا اپنی بُغچی سے"

بیوی "کیا اب کاٹی جائیں گی مونچھیں اس وقت"

منشی جی "یعنی دیکھ رہی ہو کہ ایک تو ہے بس نتھنوں تک اور دوسری تو دیکھو کہاں جا رہی ہے"

بیوی "تو یہ چھوٹی بڑی کیسے ہوگئیں؟"

منشی جی "اب میں کیا جانوں کیسے ہوگئیں۔ تم قینچی لاؤ بحث بعد میں کر لینا"

بیوی "اب مونچھوں کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ لو یہ قینچی"

منشی جی "ادھر آؤ ذرا یہ آئینہ پکڑ کر مونچھوں کی سیدھ میں کھڑی ہو جاؤ"

بیوی "لو بس ٹھیک ہے نا"

منشی جی "ایں ٹھیک ہے۔ مگر نہیں یہ تو بھویں ہیں، ذرا نیچے رکھو آئینہ۔ اور نیچے۔ بس بس اب ٹھیک ہے یونہی رہنا"

بیوی "کہیں زیادہ نہ کٹ جائے مونچھ"

منشی جی "زیادہ کیسے کٹ جائیگی۔ تم ٹوکو تو نہیں اے (مونچھ کاٹ کر) یہ لو"

بیوی "کٹ گئی نا زیادہ - کیا بُرا مُنہ ہو گیا"

منشی جی "نہ یادہ کٹ گئی؟ یہ کیسے کٹ گئی؟ اب یہ اُدھر والی بُری معلوم ہونے لگی"

بیوی "اب کہیں اسے بھی نہ کاٹ دینا"

منشی جی "تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اس ڈیڑھ مونچھ کی تصویر کھنچوا لوں؟"

بیوی "میرا کیا ہے تم اپنی گت بنائے جاؤ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ کیسی موئی جوجو کی سی صورت ہو گئی ہے۔ گنجی ہو کے رہ گئیں مونچھیں"

منشی جی "تو پھر اب کیا کروں بغیر دوسری طرف کی مونچھ کاٹے کام نہیں بن سکتا۔ اب کی میں ذرا کم ہی کاٹوں گا"

بیوی "دیکھو دیکھو دیکھو۔ پھر زیادہ کٹ جاتی"

منشی جی "میرا ہاتھ کانپ گیا تھا تم اس وقت منہ میں قینچی بھی بھونگواؤ گی"

بیوی "میرا کیا ہے تم میری طرف سے بالکل صاف کر دو مونچھیں"

منشی جی "بالکل کیسے دیکھتی تو رہو۔ ذرا آئینہ برابر رکھو۔ ہاں یوں۔ اے دو مونچھ پر قینچی چلتی ہے) یہ لو اب تو ٹھیک ہے"

بیوی "خاک ٹھیک ہے۔ اچھی خاصی مونچھوں کا ناس مار لیا ابھی اِدھر کی ذرا بڑی ہے"

منشی جی: "اُٹھانا ذرا آئینہ...... ہاں ٹیڑھی ہے بہت بڑی ہے اب اُلٹا ٹیڑھا معلوم ہو رہا ہے۔"

بیوی: "اسے نائی سے ٹھیک کراؤ نہیں تو اور خراب ہو جائیں گی مونچھیں۔"

منشی جی: "اب اس وقت نائی کی تلاش میں نکلوں۔ توبہ ہے تمام بال پسینہ میں اور بھی چپک رہے ہیں۔"

بیوی: "پھر اس میں لگا ہوا ہے گوند۔"

منشی جی: "توبہ۔ توبہ۔ میں یونہی دکھو آئینہ۔ (قینچی چلاتے ہیں) ارے رے استغفراللہ۔"

بیوی: "بس اب تو طبیعت خوش ہوئی بالکل ہی غائب کر دی ایک طرف کی مونچھ۔ بھئی اللہ مجھ سے تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی جاتی۔"

منشی جی: "اجی صورت کو ڈالو جہنم میں تصویر کا کیا ہوگا اب۔ مونچھ تو اب ندارد کے برابر رہ گئی ہے۔ اس طرف کی کچھ کچھ البتہ ٹھیک ہے۔ اچھا سنو۔ ٹھیک ہے بس تم شبن کی دوات لاؤ دوڑ کے۔"

بیوی: "دوات؟..... دوات سے کیا ہوگا؟"

منشی جی: "اچھا صاحب نہ لاؤ مگر اس وقت حجت نہ کرو میں خود لئے آتا ہوں۔ مجھے

خود ہی غصہ آ رہا ہے اس بہانے تمہاری بحث، ناطقہ بند کر دیا ہے تم نے۔

بیوی "میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔ میں لائے دیتی ہوں ابھی۔"

(بیوی جاتی ہے منشی جی بڑبڑا رہے ہیں۔)

منشی جی "توبہ ہے۔ ادھر کی ٹیک کی اُدھر کی غائب۔ اُدھر کی ٹھیک کی اِدھر کی غائب اور دھوپ الگ جا رہی ہے ...... لے آئیں؟ (بیوی آتی ہے) لاؤ ادھر اور اب ذرا خاموشی کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ آئینہ لے کر۔"

بیوی "جانے کیا کرنے کا ارادہ ہے اب موا ہر دوپ کھبرا جائے گا منہ کالا کر کے"

منشی جی "دیکھتی تو رہو۔ بس یونہی رکھو آئینہ ...... ہاں ...... اب ذرا دور ہٹ کر دیکھو کیا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل مونچھیں معلوم ہوتی ہیں نا۔؟"

بیوی "کہیں بھی نہیں صاف دکھائی دے رہا ہے کہ روشنائی کی لکیر ہے۔ اچھے خاصے بسو معلوم ہوتے ہو دسہرہ کے۔"

منشی جی ”۔ ایں؟ ۔ ۔ ۔ ٹیسو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ روشنائی ذرا ہلکی رہی ۔ اچھا اور سہی بس یہیں رکھنا شیشہ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ اب ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو تو ذرا دور ہٹ کر ۔“

بیوی ”۔ میں نہیں دیکھتی تمہارا تو دماغ چل گیا ہے اور ساتھ مجھ کو بھی پاگل بنائے ہوئے ہو ۔“

منشی جی ”۔ اچھا خیر ۔ نہ دیکھو ۔ مگر یہ گالوں میں جو گڑھے پڑے ہوئے ہیں ان کو اب کیا کروں تصویر خراب ہو جائے گی ان سے ۔“

بیوی ”۔ مونچھوں کی گت بن چکی اب گالوں میں بھی روشنائی بھر لو ۔“

منشی جی ”۔ پھر وہی ۔ اے صاحب عقل سے کام لو تو سب باتیں سمجھ میں آجائیں مگر عقل تمہارے پاس کہاں جلدی سے دو گلوریاں بنا دو یہ گڑھے بھی اُبھر آئیں گے ۔“

بیوی ”۔ گلوریاں کہاں سے بنا دوں گی سویرے سے پانوں کیلئے چیخ رہی ہوں مگر تم سنتے بھی ہو؟“

منشی جی ”۔ اچھا اچھا خیر ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا چیز ہونا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ٹھیک ہے وہ لاؤ جلدی سے وہ ۔ ۔ ۔ ۔“

بیوی ": وہ کیا اس موئے وہ کا کچھ نام بھی ہے یا بس وہ ہی وہ کیے جاؤ گے ؟"

منشی جی ": وہی میرا مطلب ہے یعنی وہ...... کیا کہتے ہیں اسے۔ مسلّم ڈلی کے دو ٹکڑے لاؤ۔"

بیوی ": لاتی ہوں۔ گھن چکّر بنا کے رکھ دیا ہے۔"

(جاتی ہے)

منشی جی ": (خود ہی بڑبڑا رہے ہیں) مونچھیں تو اب ٹھیک ہیں۔ کنگھی بھی خوب ہو گئی ہے اس وقت (زور سے) میں نے کہا لائیں وہ ڈلی کے ٹکڑے۔"

بیوی ": لا رہی ہوں۔ لا رہی ہوں۔ لاتے ہی لاؤں گی۔ لو یہ ڈلی کے ٹکڑے۔"

منشی جی ": ایک ایک گال میں ایک ایک ڈلی کا ٹکڑا ٹھیک رہے گا (گالوں میں ڈلی رکھ کر بدلی ہوئی آواز میں) اب دیکھو اب تو ٹھیک ہے ؟"

بیوی ": ہاں ٹھیک ہے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دونوں گالوں میں بتوڑیاں نکل آئی ہیں۔"

منشی جی ": بتوڑیاں ؟...... لانا تو آئینہ۔ (آئینہ لے کر) بتوڑیاں تو کیا البتہ کچھ ٹھیک نہیں رہیں یہ...... اچھا اگر دونوں گالوں میں ایک ایک نوالہ

دُکھ ہوں، دِتی کا تو۔۔۔۔۔۔"

بیوی "مگر تصویر ضرور کھنچواؤ گے اِس گت کے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے"

منشی جی "کیا مطلب ہے تمہارا؟ بغیر تصویر کھنچوائے مر جاؤں، بد بخت تا کہ اولاد کو یہ بھی پتہ نہ چلے کہ باپ بھی تھا"

بیوی "نہیں نہیں تم بُوا نہ مانو ضرور تصویر کھنچواؤ تا کہ اولاد کو یہ تو معلوم ہو کہ باپ بہرا بہرہ تھا"

منشی جی "بھئی تم سخت دلشکنی کرتی ہو میری - اس میں بہرہ ہونے کی آخر کونسی بات ہے۔ تصویر میں ان امور کا پتہ بھی نہ چلے گا اور تصویر ہی نہ ہوئی تو پھر یہ کون کہے گا۔۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔۔ وہی حسینوں کے خطوط اور تصویر بتاں۔۔۔۔۔۔ جو وہ کیا ہے شعر۔۔۔ مگر مجھے یاد نہیں تو تمہیں کیا یاد ہو گا۔ تو بولو تو اپنے دکھ لوں منہ میں؟"

بیوی "جو تمہارا جی چاہے وہ کرو۔ مگر۔۔۔۔۔۔"

(دروازہ پر دستک)

منشی جی "آیا بھئی آیا ابھی آیا بس تیار ہی سمجھو چکے سے اچھو رو تو ادہ یو الہ کو لاؤ اچکن اٹھاؤ جلدی سے"

بیوی: "اس گرمی میں یہ جو موئی جامہ وار لادی جائے گی تو مزا ہی آجائے گا۔"

منشی جی: "(شیروانی پہنتے ہوئے) جیسے ہو گا تم ٹوپی تو لاؤ میری...... وہ دیکھو
وہ رکھی ہے گھڑونچی پر۔"

بیوی: "یہ اچکن اور اس پہ یہ موئی چناّ شاہی ٹوپی۔"

منشی جی: "اچھا تو جانے دو اپنا کوئی دوپٹہ ہی دیدو صافہ باندھ لوں گا۔"

بیوی: "تیل تو چپڑا ہوا ہے تمہارے سر پہ۔"

منشی جی: "چاہے میری تصویر کمبخت خراب ہو جائے مگر تمہارا دوپٹہ خراب نہ ہو۔...
افوہ۔ سخت گرمی ہے...... اچکن تو آگ لگائے دیتی ہے۔"

بیوی: "تو یہی دوپٹہ لے لونا۔"

منشی جی: "لاؤ یہی لاؤ۔ سخت پسینہ ہے...... توبہ ہے.... لاؤ دوپٹہ۔
مگر اب اسے باندھے گا کون؟ بیوی بھی ایسی ملی ہیں جن کو صافہ تک باندھنے
کا ڈھنگ نہیں۔"

بیوی: "اے اور کیا یہ تو عورتوں کے کام ہی ہیں کہ......"

(دروازہ پر دستک اور آواز)

تصویر والا: "اجی صاحب اب تکلیف نہ کیجیے وقت نکل گیا۔"

منشی جی "تو میں بھی اب تیار ہوں بھئی (بیوی سے) رہنے دو عدالت میں ننگے سر ہی کھنچوالوں گا"

بیوی "ہے ہے - یہ سارا منہ کالا ہو گیا۔ روشنائی پسینہ میں خوب منہ بھر پر پھیلی ہے"

منشی جی "ایں ..... لانا تو آئینہ ..... لاحول ولا قوۃ"

تصویر والا "اچھا صاحب میں جا رہا ہوں"

منشی جی "اے یار ذرا دم تو لو ..... توبہ ہے یہ تو شیروانی پر بھی ٹپک رہی ہے۔ بھئی ذرا لوٹا لاؤ جلدی"

بیوی "لو لوٹا"

(منشی جی منہ دھوتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں)

نعیم محمد شریف صدیقی لاہور جنوری ۱۹۵۱ء